لمحوں نے خطا کی تھی



فوزیہ احسان رانا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ناولٹ

فوزیہ احسان رانا

لمحوں نے خطا کی تھی

''اتنی فکر مندمت ہوا کرو، معمولی سی چوٹ تھی۔'''' اُس دن آپ کی ساس نے میرے سامنے آپ کو مارا۔ اس بری طرح آپ کو جھنجوڑا اور میں بس دیکھتی رہی۔ کچھ بھی آپ کی مدد نہیں کر سکی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔'''' تم کیوں ہو رہی ہو شرمندہ، تمہارا کیا قصور بھلا''......

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا

ٹھنڈی، دودھیا چاندنی چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ چاند کی پُرسکون اور رومان بھری روشنی نے ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ رات کی رانی کی مسحور کن مہک اطراف میں بکھری ہوئی تھی۔ خاموش رات اپنے اندر بھید بھرا اسرار چھپائے ہوئے تھی۔ ماحول کی پاکیزگی نے ایک سحر سا طاری کر رکھا تھا۔

وہ لوہے کے اونچے سے تخت پر تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اُس کے پہلو میں اُس کا کیوٹ سا بیٹا لیٹا ہوا تھا جو بمشکل تین، ساڑھے تین سال کا تھا۔

''مما......'' اسد نے کروٹ بدلی تو اِک نرم و گداز، گدگداتا ہوا سا احساس اُس کے رگ و پے میں ممتا کی حلاوت بھرنے لگا۔ اُس نے وارفتگی سے اپنے پہلو میں کسمساتے معصوم اور نازک وجود کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ ڈالا۔ اندر دور تک سکون اُتر گیا۔ وہ یونہی اُسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے دباتی رہی، تھپکتی رہی، محویت سے اُس کے گھنے سیاہ بال دیکھتی رہی، پھر وفورِ جذبات میں اُس نے اپنے ہونٹ بچے کے بالوں پر رکھ دیے۔

''مما......'' وہ سیدھا ہوا۔

''جی جان۔''

''بابا کب آئیں گے۔'' وہ نرسری کا بچہ تھا مگر اُردو بہت صاف بولتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اُس کی مما نے اُس سے اُس وقت باتیں کرنا شروع کر دی تھیں جب وہ محض ایک دو ماہ کا تھا۔

''بابا کب آئیں گے۔'' اب کی بار اُس کی معصوم آواز میں ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی تھی۔ ماں کی توجہ نہ پا کر اُس کا غصے میں آنا ایک فطری عمل تھا۔ وہ ماں کی بھرپور توجہ کا عادی تھا۔

''آ جائیں گے بیٹا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''بابا آئیں تو میں اُن سے بات نہیں کروں گا۔'' وہ بسورا ماں نثار ہونے لگی۔

''کیوں؟''

''بس خفا ہوں میں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر آنکھوں پر رکھ لیں۔



''اچھا میری بات سنو۔'' اُس نے بچے کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اُس کے ہاتھوں کو آنکھوں پر سے ہٹایا اور اُسے کہانی سنانے لگی۔ بچہ بہل ہی گیا۔ بچے تو بہل ہی جایا کرتے ہیں۔ کبھی کھلونوں سے، کبھی شہزادے کی کہانی سے، مگر کب تک۔

''مما چاند کتنا خوبصورت ہے نا۔'' اُس کا معصوم ذہن اب آسمانوں کی وسعتوں میں سفر کرتے چاند میں اٹک گیا۔ وہ چاند کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اُس کے گلابی پھولوں جیسے ہونٹ پھیلنے سکڑنے لگے۔ آنکھوں میں بے تحاشا روشنی سی بھر گئی اور گال تمتمانے لگے۔

''تم بھی تو چاند ہونا، میرے چاند۔'' اُس نے ممتا کے جذبے سے سرشار ہو کر کہا۔

''وہ چاند زیادہ اچھا ہے مما۔'' بچے نے اُفق کی جانب ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

''نہیں، میرا چاند اُس چاند سے زیادہ پیارا ہے۔'' وہ قطعیت بھرے انداز میں لاڈ سے بولی۔

''نہیں مما، آسمان والا چاند بہت اچھا ہے۔'' اُس نے بازو پھیلا کر 'بہت' پر زور دے کر کہا وہ چپ رہی۔

''چاند میں ماموں نظر آتا ہے مما۔'' اس کا بچے کے بالوں میں سرسراتا ہاتھ یک لخت رُک گیا۔ ٹھنڈی چاندنی رات اُسے لمحوں میں سلگا گئی۔ اُس کے ہونٹ پل میں خشک ہوئے۔

''چندا ماموں، چندا ماموں۔'' وہ خوشی سے تالیاں پیٹتا رہا اور وہ لرزیدہ وجود کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن منتشر ہو کر بے قابو ہو کر بدن میں اُدھم مچا رہی تھی۔ بچہ سو چکا تھا مگر وہ جاگ رہی تھی اُس کی سانس رُک رہی تھی۔ پیاس کا احساس شدت سے جاگا تھا، یوں لگ رہا تھا حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔ اُس نے ایک نظر پُرسکون سوتے بچے کو دیکھا اور اُٹھ بیٹھی۔

''ماموں۔'' اُس نے زیرِ لب دہرایا اور اُس کے اندر باہر درد پھیلنے لگا۔ اُس نے لبوں سے نکلتی آہوں اور سسکیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ کی ہتھیلی جما دی مگر اُسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ وہ تخت سے اُٹھی اور پاؤں میں چپل اُڑس کر بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی۔ فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور لبوں سے لگا لی۔ وہ غٹا گٹ بہت سارا پانی پی کر بھی اپنا حلق تر نہیں کر پائی تھی۔ تن من لق دق صحرا بن گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکلی، پاؤں بالکل بے جان ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ویرانی بھری وحشت اُتر آئی تھی۔

''ماموں۔'' وہ خشک ہوتے ہونٹوں سے بڑبڑائی۔ اُسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے روشن رات تاریکی کے لبادے میں لپٹی دکھائی دینے لگی۔ وہ اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی، خوف اور ڈر کی سرد لہر شریانوں میں بھاگتے دوڑتے گرم جذبات سے لبریز لہو کو جمانے لگی۔

قریب ہی شہتوت کے درخت میں سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ شاید کوئی پتا گرا تھا، وہ سہم گئی۔ سناٹا اُس کی روح میں اُتر گیا تھا۔ کیسی خاموشی تھی، سرد اور مردہ، تلخ کڑوی، کڑواہٹ زدہ، اُس نے اپنے ٹوٹے بکھرے لرزیدہ وجود کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں چھپا لیا اور آہوں اور سسکیوں کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت دے دی۔ اُن پر اب کوئی بند نہیں باندھا۔

''ماموں'' لفظ اُس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی مانند برس رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دہکتے الاؤ میں جلتا دیکھ رہی تھی۔ درد نے اُسے گھائل ہی نہیں، پژمردہ اور نڈھال بھی کر دیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کے ایک لفظ

'ماموں' نے اُسے اندر تک جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہول کر رہ گئی۔ زخم خوردگی سے وہ بلبلاتی رہی۔ زخموں سے ٹیسیں اُٹھتی رہیں، روح میں سناٹا چکرانے لگا۔ روتی رہی، کراہتی رہی، اُس کے اندر دور تک دراڑیں پڑتی رہیں۔

اُس کی دردناک سسکیاں ہولناک سناٹوں میں گونجتی رہیں۔ خاموش فضا میں ارتعاش برپا کرتی رہیں۔ وہ رو رو کر بے دم ہوگئی۔ بے کسی سے اُس نے اپنا سر اپنی ہی گود میں گرالیا اور بے جان بازوؤں کو اپنے ٹوٹے بکھرے وجود کے گرد لپیٹ لیا۔ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے آنکھوں کے اندر کسی نے مٹھی بھر مرچیں ڈال دی ہوں۔ اُس کی ہچکیاں وقفے وقفے سے کربناک دہشت زدہ سناٹے میں اُبھرتی رہیں۔ فجر کی اذان کی آواز اُس کی سماعتوں میں پہنچی، وہ چونکی۔ اتنا وقت گزر گیا۔ ساری رات تمام ہوئی وہ بے آواز روتے ہوئے سر اوپر اٹھا کر گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر سیاہ گھور اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ خاموشی اور خوف سرسراتے ہوئے اُس کی ہڈیوں میں اُتر کر اعصاب کو شل کر رہے تھے۔

وہ ابھی تو ذرا سا ہی سکون کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ پائی تھی کہ اُس کے بیٹے کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ نے دل کی دنیا تہہ بالا کرکے دل میں دھواں سا بھر دیا تھا۔ سارا سکون درہم برہم کردیا تھا۔ سارے زخم ہرے کردیے تھے۔ وہ اُٹھی اور بے جان قدم واش روم کی طرف بڑھا دیے۔ ابھی اُسے وضو کرکے نماز پڑھنی تھی۔ غرض کے سجدے ادا کرنے تھے۔ خدا کی بارگاہ سے دل کا سکون مانگنا تھا۔

''جسے کہیں سکون اور طمانیت اور خوشی نہ ملے۔ جسے سارا زمانہ دھتکار دے۔ سارا عالم ٹھکرا دے۔ اُسے خدا کی ذات اپنی رحمت کی بانہوں میں پناہ دے کر سمیٹ لیتی ہے۔ سکون عطا کرتی ہے۔ طمانیت سے دامن بھر دیتی ہے۔

جسے کوئی معاف نہیں کرتا، اللہ اُسے بھی معاف کردیتا ہے، بس مانگنے والے کو مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ اس کے پاس بھی آخری در خدا کا ہی بچا تھا۔ ہر کسی کے پاس آخری در خدا ہی ہوتا ہے جہاں آنسوؤں کو دیکھ کر اندر آنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ بہت پسند ہیں خدا کو ندامت کے آنسو۔

☆......☆......☆

''مما۔'' اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی مما کی نازک سی کلائی پکڑ کر دھیرے سے ہلائی۔

''مما اٹھو۔'' اب کی بار وہ ذرا زور سے بولا اور اپنی دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں اُس کی کلائی زور سے بھینچ ڈالی۔ سختی بھری گرفت سے وہ ذرا سا کسمسائی مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔

''مما اٹھو مجھے بھوک لگی ہے۔'' وہ چڑ کر شور کرنے لگا اور ساتھ ساتھ اُسے ہاتھوں سے مارنے لگا۔

''تم گندی مما ہو، گندی ہو۔'' وہ بیڈ سے اُتر کر چلانے لگا۔ درشتی سے چیزوں کو پٹخنے لگا۔ تبھی اُس کی آنکھ کھلی وہ ناسمجھی کے عالم میں خالی خالی نظروں سے اپنے سامنے دیکھتی رہی، پھر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ شدتِ گریہ اور تمام رات اذیت میں گزارنے کے بعد ابھی تو ذرا کی ذرا اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ بے سدھ سوئی پڑی تھی جاگ تو گئی تھی مگر اُس کے اعصاب ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے اور آنکھیں کھولنے سے آنکھوں میں شدت سے جلن اور تپش سمٹ آئی تھی۔

''تم گندی مما ہو۔'' وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا کیوٹ سا گپلو سامنا آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر قہر سجائے اپنی مما کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے الفاظ کیسے تھے۔ دل کو کاٹتے ہوئے دل کو چیرتے ہوئے اُس کی رتجگے کی ماری آنکھیں برسنے لگیں۔ یوں لگا جیسے زخموں پر نمک پاشی ہو رہی ہے۔

''نہیں، نہیں بیٹا میں گندی مما نہیں ہوں۔'' وہ عجلت میں بیڈ سے اُتری۔ اُس درد کی ماری کا نازک سا پاؤں بیڈ کی چادر میں اُلجھ کر رہ گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اوندھے منہ فرش پر گری تھی۔ اُس کی پیشانی ماربل کے چکنے فرش سے ٹکرائی اور پیشانی پر گومڑ سا اُبھر آیا۔ وہ کمرے کے وسط میں بکھری پڑی بس 'سی' کر کے رہ گئی۔ وہ بچہ جو چند لمحے پہلے غیض و غضب کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اب بدحواس ہو کر رونے لگا۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی مما کو فرش سے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''مما اٹھیں۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔ تبھی بشیراں (ملازمہ) اندر آئی اور اُسے نیچے گرے دیکھا تو لپک کر سامنے آئی اور سہارا دے کر اُسے اٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ اُس کے ٹخنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ وہ پاؤں میں بہت درد محسوس کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

''باجی صاحب کو فون کروں؟'' بشیراں نے پاس بیٹھ کر کہا مگر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اسے منع کر دیا۔

''باجی آپ کا تو ٹخنا بری طرح سے چھل گیا ہے، درد بھی ہو رہا ہوگا۔'' بشیراں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کا سفید گلابی مائل پاؤں اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہولے ہولے دبانے لگی۔

''باجی ذرا دیکھیں تو خون رس رہا ہے، آپ کہو تو فون کر دیتی ہوں۔ شہر سے آتے ہوئے صاحب کوئی دوائی لیتے آئیں گے۔'' بشیراں صحیح معنوں میں اُس کی وفادار اور غمگسار تھی۔ وہ اِس بات سے بخوبی آگاہ تھی بشیراں نیک فطرت خاتون تھی۔

''رسنے دو خون، میں اِسی قابل ہوں کہ میں دردر کی ٹھوکریں کھاؤں، دھکے کھاؤں مگر کہیں کوئی سہارا نہ ملے، کوئی پناہ نہ ملے۔'' اُس نے خود اذیتی کی شدت میں اپنا نچلا ہونٹ کچل ڈالا۔

وہ تو ملازمہ تھی، وہ اُس سے کیا کہتی کہ اُس کے تو اندر اتنے زخم ہیں اتنے گھاؤ کہ جن کا شمار ممکن ہی نہیں اور برسوں سے اُن زخموں سے خون رس رہا ہے اور کون جانے کب تک رستا رہے گا۔

فاخرہ جبیں صرف سوچ کر رہ گئی۔ بولی کچھ بھی نہیں، بس بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی رہی اور ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ بشیراں بغیر کہے اُس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ آنسو فاخرہ کی بند آنکھوں کی گھنی سیاہ پلکوں کو بھگوتے رہے۔ وہ اپنی ذات میں کتنی اکیلی تھی کوئی اس سے فاخرہ سے پوچھتا آنسوؤں کا پانی قطرہ قطرہ اُس کے سفید گالوں پر بہنے لگا۔ اُس نے اپنے گال صاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یونہی بے آواز روتی رہی۔ بشیراں نے ترحم آمیز نظروں سے فاخرہ کو دیکھا اُس کا دل اپنی مالکن کی بے سروسامانی پر بھر آیا۔ اتنی حسین عورت کہ جسے دیکھ دیکھ کر دل نہ بھرے، اتنے مصائب اور کٹھن نامساعد حالات نے بھی اس کے صبیح چہرے پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مضموم و آزردہ عورت جس کا من اور تن دونوں ہی لہولہان تھے مگر اُس کے چہرے کی تازگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

بشیراں نے فاخرہ کے دل نواز نقوش کے سحر سے بمشکل نظریں چرائیں اور کچھ سوچ کر اُٹھی اور مختلف درازیں کھنگالنے لگی کہ کوئی مرہم مل جائے کوئی کولڈ کریم ہی مل جائے تا کہ وہ اُس کے زخمی گھٹنے پر لگا دیتی۔ مگر بہت تلاش بسیار کے باوجود بھی کوئی دوا، کوئی مرہم نہیں ملا تھا۔

''باجی میں کوئی دوا ڈھونڈ رہی تھی تا کہ آپ کے لگا دوں مگر ملی ہی نہیں۔'' بشیراں دوبارہ فاخرہ کی ٹانگیں دباتے ہوئے بولی۔ جواباً فاخرہ نے کچھ نہیں کہا تھا بس سسکتی رہی آہیں بھرتی رہی۔

زمان کو پچھلے دو دن سے بخار تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی اُسے آ کر لے گیا تھا تا کہ اُسے دوائی لے دے

اور رات کو واپس چھوڑ کر جانے کی بجائے اپنے گھر ہی لے گیا تھا۔

''تیری ٹانگیں ٹوٹ تو نہیں گئیں جو یوں بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے دیوار ہی ہے۔ بچہ باہر بھوکا روتا پھر رہا ہے۔ اِدھر سوگ منانے سے ہی فرصت نہیں ہے۔''
زمان کی ماں نے کمرے میں آتے ہی جو یہ منظر دیکھا مانو اُس کے سر سے لگی پیروں تک چلی گئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر فاخرہ کے کالے سیاہ بال اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑ کر اتنی زور سے کھینچ لیے کہ فاخرہ کی درد سے جان نکلنے لگی۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کرسکی۔ فاخرہ کی ٹانگیں سکڑ کر پیٹ سے آن لگیں۔ اُس کا وجود گٹھڑی بن گیا۔ ڈری سہمی کپکپاتی گٹھڑی فاخرہ کے بال چڑیا کا گھونسلا بن چکے تھے۔ اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اُس عورت نے (جو فاخرہ کی ساس اور اُس کے شوہر زمان کی ماں تھی) یہاں تک بس نہیں کیا اب وہ قہر کی طرح برسی تھی۔ اُس نے فاخرہ کی کمر پر دو ہتھڑ مارنا شروع کردیے مارتی رہی۔ پھر اُس کا سکڑا سمٹا وجود کسی غلیظ ڈھیر کی طرح پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا۔ فاخرہ کا سر زوردار آواز کے ساتھ فرش سے ٹکرایا تھا مگر فاخرہ نے سی تک نہیں کی تھی۔ کراہنا یا تڑپنا، بلکنا تو در کنار اُس نے تو ایک آہ بھی نہیں بھری تھی۔ اب وہ ظالم خرانٹ عورت اُسے اپنے سخت پیروں سے ٹھوکریں مار رہی تھی۔ فاخرہ بے حس و حرکت یوں پڑی تھی جیسے اُس کے اندر سانس باقی ہی نہیں رہی ہو۔ زندگی نے اُکتا کر اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ہو کہ اے کمزور عورت! تیرے جیسی بے حس عورت کو میری ضرورت ہی نہیں، تو ٹھیک ہے مجھے بھی تیرے ساتھ نہیں رہنا۔''
''تُو اچھی بیوی تو کبھی بن ہی نہیں سکی اور بن بھی نہیں سکے گی، مگر اچھی ماں تو بن کر دکھا گھٹیا عورت۔ تُو تو ناگن ہے ناگن، جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے۔''

اِس بات پر فاخرہ نے زور سے بند کی ہوئی آنکھیں کھولیں اور ایک ایسی نظر سامنے کھڑی عورت پر ڈالی کہ وہ پل بھر کے لیے فاخرہ کے تیور بھانپ کر ٹپٹا کر رہ گئی۔ کیسی وحشت در آئی تھی فاخرہ کی آنکھوں میں، جیسے وہ اُسے کچا چبا ڈالے گی۔

''میرے بچوں کے سامنے میری تذلیل مت کرو خالہ! مجھے معاف کردو۔ میری اولاد کی نظروں میں مت گراؤ مجھے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے! مجھے اپنی اولاد کی نظروں میں حقیر مت کریں۔'' فاخرہ اُس کے قدموں سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رو دی۔ بشیراں سے اُس کی یہ حالتِ زار دیکھی نہیں جاتی تھی مگر اُس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اُس کو سہارا دیتی اِس وقت۔

''اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ ذرا بدکردار عورت! تُو ہے اِس قابل کہ تجھے معاف کردیا جائے۔''
اُس نے دانت کچکچاتے ہوئے فاخرہ کے منہ پر پاؤں سے ٹھوکر ماری، نرم گال پر ضرب لگی تھی۔

''اور تُو ٹسوے کس چکر میں بہا رہی ہے۔ کان کھول کر سُن! تجھے اِس حرافہ کی تیمار داریوں کے لیے نہیں رکھا گیا ہے کہ تُو اِس عورت کے ناز نخرے اٹھائے، اِس کی ناز برداریاں اٹھائے۔'' اب اُس مردمار عورت کا روئے سخن بشیراں کی طرف ہوا۔ اُسے بشیراں کی خیر خواہی بری طرح کھٹکتی تھی۔
''مت بھولو کہ تمہیں اِس عورت کی خبر گیری کے لیے رکھا گیا ہے۔ تمہیں ہر وقت سائے کی مانند اِس کے ساتھ رہنا ہے۔ اِس کے پل پل کی رپورٹ مجھے دینی ہے اور اِس کے لیے میں تمہیں تنخواہ دیتی ہوں، لہٰذا تمہیں اِس عورت سے ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں تم۔'' اُس نے بے حس و حرکت کھڑی بشیراں کو جھنجوڑ ڈالا۔ اِس عورت کا طنطنہ، اِس عورت کا گھمنڈ نجانے کیا دن دکھانے والا تھا۔

''دادو مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ مجھے کچھ کھانے کو دے دیں۔'' اسد زمان اُس کی ٹانگوں سے لپٹا کہہ رہا تھا۔ اُس عورت سے جو ڈائن تھی سفاک ہونے کی حد تک ظالم تھی۔

''اپنی ماں سے مانگ، جیسی تیری ماں ویسا تُو ناگن کا سنپولیا۔'' وہ بکتی جھکی منہ سے کف اُڑاتی، پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ بشیراں نے لپک کر اسد کو گود میں اٹھالیا جو بھاں بھاں کر کے رو رہا تھا۔

☆......☆......☆

زمان احمد کا بھائی رحمان احمد، زمان کو گھر چھوڑنے آیا تھا۔ دو کمروں کا نیم پختہ گھر، ذرا سا کچن۔ دروازے کے سامنے رکشہ رکنے کی آواز آئی تھی پھر کسی نے دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالا تھا۔ صبا اور فضا ابھی اسکول سے آئی تھیں جبکہ اسوہ اور اسد چھوٹے سے ایک کھلونے کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ دروازہ پھر سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے والے کے انداز میں عجلت ہی نہیں ایک محسوس کی جانے والی جارحیت بھی تھی۔ صبا اور فضا نے ٹی وی کی آواز فُل کھولے اپنی اچھل کود میں لگی ہوئی تھیں۔ اماں دوسرے کمرے میں اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھائے بے خبری کی نیند سو رہی تھی، گہری نیند۔ ایسی پُرسکون نیند کہ لگتا نہیں تھا کہ جلد اُس کی آنکھ کھلے گی اور باہر رحمان دروازہ توڑ دینے کے درپے تھا۔ اُسے غصہ آ رہا تھا، بہت آ رہا تھا بے تحاشا غصہ مگر کس پر...... فاخرہ جیسی پر، اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بند دروازے کے پار فاخرہ کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر نوچ کھسوٹ ڈالے، خراشیں ڈال دے۔

''بدبخت عورت نجانے کیوں دروازہ نہیں کھول رہی۔'' زمان نے دروازے پر زوردار لات مار کر تنفر سے کہا۔ جو طیش رحمان کو فاخرہ پر آ رہا تھا ویسا ہی تاؤ زمان کو بھی آ رہا تھا۔ سب کو فاخرہ پر غصہ آتا تھا اور سب بلادریغ اظہار بھی کرتے تھے۔ نفرت کا، کراہیت اور حقارت کا۔

رحمان نے زمان کو ذرا سا ٹہوکا دیا پھر کچھ خیال آیا کہ وہ تو دیکھ نہیں سکتا اُس کا مقصد سامنے آتی فاخرہ کی طرف رحمان کی توجہ مبذول کروانا تھا مگر وہ اپنے بڑے بھائی کی بے نور آنکھوں کو محض دیکھ کر رہ گیا۔

''ہوگئے تمہارے سیر سپاٹے ختم۔'' رحمان نے بدتمیزی سے اکھڑ لہجے میں کہا۔ فاخرہ نے استفہامیہ اُسے دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہنا بھی بے سود ہی ٹھہرتا، کیا فائدہ اپنی حاضر جوابی دکھانے کا، جب کوئی فائدہ ہی نہیں، کیا اُسے نظر نہیں آ رہا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ صد شکر کہ دروازہ اندر سے کھل گیا۔ خالہ اماں آنکھوں میں نیند کا خمار لیے کھڑی تھیں۔ سب کو ایک نظر باری باری دیکھا، فاخرہ نے، قہر آلود سلگتی نظروں سے، اندر تک کاٹتی نگاہیں، پھر اُن کی نظریں تپے ہوئے رحمان پر رکیں جو پہلو بدل رہا تھا، اُس کے ساتھ چپکا زمان۔

''سلام اماں۔'' رحمان نے لٹھ مار انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، آجا پتر اندر آ۔'' وہ درمیان اٹکی تھی دروازے کے، ذرا سا سائیڈ پر کھسکی۔

''مجھے اندر نہیں آنا، بھائی کو اندر لے جاؤ۔'' وہ یوں ہی اکڑا اکڑا بولا فاخرہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

خالہ اماں نے زمان کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف مڑیں، جاتے ہوئے رحمان نے ایک کٹیلی سرد نگاہ فاخرہ پر ضرور ڈالی تھی۔ یہ اُس کے سسرالی رشتے تھے جن کے لیے فاخرہ ایسی ہستی تھی جس میں زمانے بھر کی خامیاں تھیں۔ اُس کی ہر خامی ناقابلِ برداشت، اُس کی ہر غلطی ناقابلِ تلافی اور اس کا میکہ......

فاخرہ نے آتے ہی کپڑے تبدیل کیے اور کھانا پکانے میں جت گئی۔ بشیراں اُس کی مدد کروا رہی تھی۔

رات کو وہ گھر کے کاموں سے فراغت پا کر کمرے میں آئی تو دیکھا صبا اسوہ کو ساتھ لگائے تھپک

رہی تھی جبکہ اسوہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر کہانی سننے کی ضد کر رہی تھی۔ کھانے کے خالی برتن کمرے کے فرش پر بکھرے پڑے تھے بشیراں کو شاید گھر جانے سے پہلے دھیان نہیں رہا تھا برتن اُٹھانے کا۔

''مما اسوہ ایک ہی بات پر اڑی ہوئی ہے کہ مما سے کہانی سننی ہے جبکہ میں نے کہا بھی کہ مجھے بھی کہانی آتی ہے شہزادی کی اور ظالم جادوگر کی۔'' صبا نے فاخرہ کو دیکھ کر بتایا۔

''بیٹا میں سناتی ہوں کہانی ذرا کمرہ سمیٹ لوں۔'' فاخرہ نے دونوں بچیوں کے یونی فارم چارپائی سے اُٹھا کر الماری میں لٹکائے، اُن کے اسکول شوز اکٹھے کر کے رکھے، اسد کے کھلونے سمیٹے پھر کھانے کے برتن اُٹھا کر کچن میں رکھنے چلی گئی۔ جاتے جاتے ذرا سا دوسرے کمرے میں جھانکا، اسد اپنے باپ کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور خالہ اماں زمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ فاخرہ کچن میں۔ وہ بھی برتن دھو کر جب اپنے کمرے میں آئی تو یہ دیکھ کر اُس کا دل ملال سے رونے لگا، فضا اور صبا کے درمیان میں اسوہ سوئی پڑی تھی۔ وہ تینوں ماں کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ اسوہ کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اُس کے نازک گالوں پر آنسوؤں کے نشان تازہ تھے۔ فاخرہ کا دل تڑپنے لگا۔ اُس کی مجبور ممتا ہر رات، ہر دن ایسے ہی بلکتی تھی۔ باوجود چاہنے کے بھی وہ اپنے بچوں کے لیے بہت سارا تو در کنار، تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال پاتی تھی۔ اُس نے وہیں اپنی بیٹیوں کے پاس جگہ بنائی اور لیٹ گئی دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا کب آنکھ لگ گئی۔ اُس کا نیند میں ڈوبا ذہن ابھی پوری طرح سکون بھی نہیں پا سکا تھا کہ کسی نے اُسے بے دردی سے جھنجوڑ ڈالا۔

''اری بے حس عورت کس قدر ظالم ہے تُو، تیرے شوہر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تُو آرام سے سوئی ہوئی ہے۔ اُٹھ جا اس نمانے کے پاس جا۔'' فاخرہ کا ذہن سوئی جاگی کیفیت میں ڈوبنے لگا، بدن جو آرام پانا چاہ رہا تھا ذہنی یکسوئی نصیب نہیں ہوئی تو جیسے اعصاب کھنچ کر رہ گئے۔ بدن میں درد کی لہریں سی اُٹھ کر فاخرہ کو بدحال کرنے لگیں۔

''اب جا بھی اُس کے پاس احسان فراموش عورت، قدر کر اُس فرشتہ صفت انسان کی۔'' فاخرہ اُٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں زمان اسد کو ساتھ لپٹائے لیٹا تھا۔ جیسے ہی فاخرہ کمرے میں آئی زمان دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پچھلے چودہ سالوں سے فاخرہ کے قدموں کی چاپ سے آشنا تھا۔ اُس کے بدن کی خوشبو زمان کے بدن کا حصہ تھی۔

''تم آگئیں فاخرہ۔'' جیسے ہی وہ بیڈ پر آ کر بیٹھی زمان نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' فاخرہ نے اب دونوں ہاتھوں میں زمان کا ہاتھ دبا کر کہا۔

''بخار تو اب نہیں ہے مگر بدن میں بہت درد ہے، کروٹ نہیں لی جا رہی۔''

''دبا دوں۔''

''ہاں دبا دو اور تب تک دباتی رہنا جب تک میری آنکھ نہ لگ جائے۔'' زمان نے اپنے ہاتھ سے اسد کے نقوش ٹٹولتے ہوئے کہا۔ وہ اکثر ایسے ہی اپنے بچوں کے نقوش کو چھو چھو کر دیکھا کرتا محسوس کیا کرتا تھا۔

فاخرہ ذرا سا آگے کھسکی اور پیروں کی طرف بیٹھ کر زمان کے پاؤں دبانے لگی۔ فاخرہ نرم گورے ملائم ہاتھوں سے زمان کے گہرے سیاہ پاؤں کو دباتی رہی، اُبھری ہڈیوں والے سخت سوکھے ہوئے پاؤں، فاخرہ کے ہاتھوں میں ہڈیاں چبھتی رہیں فاخرہ کا سر مارے نیند سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اُس کی پلکیں بار بار جڑ رہی تھیں۔ فاخرہ خود پر جبر کر کے بند آنکھوں سے زمان کو دباتی رہی۔ میٹھی غنودگی نے ایک بار تو اُسے نیند میں پہنچا بھی دیا مگر یہ لمحوں کی بات تھی فاخرہ جھٹکا کھا کر

سیدھی ہو بیٹھی، زمانے بھر کی تھکن اُس کی پور پور میں سما رہی تھی۔

''فاخرہ اِدھر آ میرے پاس۔'' زمان نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ فاخرہ نے ایک آزردہ سی سانس خارج کی اور زمان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آگے ہو کر لیٹ گئی۔ زمان کا ہاتھ کسی لکڑی کی مانند فاخرہ کے بالوں میں سرسرانے لگا پھر اُس کا ہاتھ فاخرہ کے بالوں کی لمبائی ناپنے لگا۔ وہ بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

''تمہارے بال بہت لمبے اور ریشمی ہیں نا۔'' زمان نے یہ سوال ہزاروں بار پہلے بھی پوچھ رکھا تھا۔

''جی بہت لمبے گھنے سیاہ بال۔'' فاخرہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تمہاری پیشانی کیسی ہے۔'' یہ بھی پرانا سوال تھا مگر ہر بار نیا تجسس دبا ہوا ہوتا تھا سوال میں۔

''جی بہت چمکتی ہوئی کشادہ، جیسی بخت آوروں کی ہوتی ہے۔'' فاخرہ نے سسکاری لی اُس کی پیشانی کشادہ روشن تھی مگر وہ بخت آور نہیں تھی مقدر کی سیاہی نے اُسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

''رو رہی ہو کیا؟'' اب زمان کو خدشہ لاحق ہوا کہ شاید وہ رو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ اب فاخرہ کے نین نقوش کھوج رہے تھے۔ زمان کے ہاتھ کی انگلی فاخرہ کی آنکھ میں کھب گئی بلا کا درد اٹھا تھا اور آنکھ سے پانی بہہ نکلا۔ فاخرہ کے دل سے کراہوں کا سیلاب اُمڈ چلا آ رہا تھا مگر اُس نے بے دردی سے اپنی آہوں کو ہونٹوں میں ہی دبا لیا اور کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

''فاخرہ مجھے بتاؤ تمہاری آنکھیں، تمہاری ناک، تمہارے ہونٹ کیسے ہیں۔'' زمان کے انداز میں نجانے کیا تھا کہ فاخرہ نے آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اوپر اُٹھا کر زمان کو دیکھا۔ زمان کی آنکھیں بند تھیں۔ کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آخر وہ یہ کیوں پوچھ رہا ہے کرید رہا ہے۔ جستجو تھی کوئی کھوج یا پتا نہیں مگر فاخرہ بے دلی سے بولی۔

''میری آنکھیں بڑی بڑی ہیں، بولتی ہوئی، اپنی طرف کھینچتی ہوئی۔ میری ناک ستواں اور ہونٹ ایسے جیسے تازہ گلاب۔'' زمان کا ہاتھ فاخرہ کے بدن پر سرسرانے لگا۔ پھر زمان اُس سے بدن کے خدوخال پوچھنے لگا۔ اپنا شوہر اپنی ہی بیوی کو کھوجتا رہتا تھا۔

''تم بہت خوبصورت اور مکمل عورت ہو۔'' زمان خمار آلود لہجے میں بولا۔ فاخرہ ٹھٹکی یعنی وہ جاگنے اور جگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ فاخرہ کو اپنا وجود ٹوٹتا بکھرتا محسوس ہو رہا تھا وہ صبح سب سے پہلے اٹھتی تھی اور سب کے بعد سونا نصیب ہوتا تھا۔

''سُنا ہے وہ بھی بہت پُرکشش نوجوان تھا۔'' زمان نے کوئی تیر فاخرہ کے روح و بدن میں اُتارا تھا وہ اب ایسے طنزیہ کاٹ دار جملوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لیے اب بہت اطمینان سے جواب دے دیتی تھی۔

''جی!! بہت ہینڈسم اور وجیہہ تھا۔''

''یاد آتا ہے نا بہت۔'' زمان کے ترکش میں بہت تیر تھے، اپنے تئیں گھائل کرنے کے لیے۔

''بالکل نہیں قطعی نہیں۔'' وہ زور زور سے ہنسا پھر ہنستا رہا۔

''کہاں وہ پڑھا لکھا ڈیسنٹ مرد اور کہاں میں، میٹرک پاس بھی نہیں عام سا مرد کا لاکلوتا۔'' وہ پھر ہنسا۔

''ادھورا مرد اندھا مرد۔'' ہاہاہا۔ فاخرہ نے تاسف سے زمان کو دیکھا وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھا اور وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا کہاں زمان اور کہاں فاخرہ جیسی، کوئی چیز بھی تو دونوں میں مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ شکل و صورت، تعلیم، ذہانت، کچھ بھی مگر حالات و واقعات تو شاہوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو وہ کیا چیز تھی۔

فاخرہ واش روم سے فارغ ہو کر آئی، گیلے بال سُلجھا کر وہ بس سونے کے لیے لیٹ گئی۔ وہ کچھ بھی ایسا تلخی بھرا نہیں سوچنا چاہتی تھی جو نیند کو اُس کی

آنکھوں سے کوسوں دور بھگا دے۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ اپنی طاقت، اپنی ہمت اور صبر پر حیران تھی کہ بھلے اُس کا دل اپنوں کے ستم پر اُن کے ڈھائے جانے والے مظالم پر کتنا ہی ماتم کناں ہوتا مگر بند نہیں ہوتا تھا۔ وہ مر کیوں نہیں جاتی تھی۔ روز روز کے مرنے سے ایک بار ہی مر جاتی مگر جینا کتنا ہی دشوار اور دقت طلب ہو، مرنا اُس سے بھی کہیں کٹھن اور ہولناک ہوتا ہے۔ اتنی ذلت، اتنی خواری پر فاخرہ کا تن بدن سُلگتا رہتا۔ اپنی ذات کی پامالی اُسے کاٹتی رہتی، مارتی رہتی مگر اب وہ اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر زندہ تھی اور زندہ رہنا چاہتی تھی۔ کسی آس، کسی اُمید کے سہارے شاید وہ بھی معتبر ہو جائے مگر کیا پتا آنے والا وقت فاخرہ جبیں کی چھید بھری جھولی میں کیا ڈال دے۔

فاخرہ جب اُٹھی تو نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ وہ کبھی کبھی ہی فجر کی نماز پڑھ پاتی تھی۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح جلدی آنکھ نہیں کھل پاتی تھی۔

فاخرہ نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا۔ آٹا گوندھا اور جلدی جلدی پراٹھے بنانے لگی۔ اتنی دیر میں بشیراں بھی آ گئی۔ اُس نے صبا اور فضا کو جگایا اور اُن کی اسکول جانے کی تیاری کروانے لگی۔ پھر بشیراں بچیوں کو ناشتا کروانے لگی۔ فاخرہ نے کپڑے بدلے، چند لقمے زہر مار کیے، آدھا کپ چائے پی، برقع اوڑھا اور سوتے ہوئے اسد اور اسوہ کو پیار کیا اور ایک نظر خالہ اماں کو دیکھا، وہ سو رہی تھیں۔

باہر رکشہ آ کر رُکا بشیراں نے صبا اور فضا کو اُس میں بٹھا دیا رکشہ چل پڑا۔

فاخرہ کا اسکول قریب ہی تھا دو گلیاں چھوڑ کر اس لیے وہ پیدل ہی جاتی تھیں دونوں۔

''آپ کا پاؤں اب کیسا ہے؟'' بشیراں کے پوچھنے پر فاخرہ چونکی۔ پھر یاد آنے پر بولی۔

''اتنی فکر مند مت ہوا کرو، معمولی سی چوٹ تھی۔''

''اُس دن آپ کی ساس نے میرے سامنے آپ کو مارا۔ اس بری طرح آپ کو جھنجھوڑا اور میں بس دیکھتی رہی۔ کچھ بھی آپ کی مدد نہیں کر سکی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔''

''تم کیوں ہو رہی ہو شرمندہ، تمہارا کیا قصور بھلا۔''

''آپ خود کماتی ہیں، خود اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہیں، پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ایسے کٹھور اور سنگدل لوگوں کو، جو آپ کو انسان نہیں سمجھتے۔'' وہ سچی مخلص تھی۔

''چھوڑنا نہیں چاہتی، کیونکہ میں اب ایک ماں ہوں، باقی کچھ نہیں، ماں ہونا میرے اندر توانائیاں بھر دیتا ہے۔ میں نئے سرے سے اپنے اندر زندگی کو جوان ہوتے، سانس لیتے دیکھتی ہوں۔ اولاد ہر ماں کا سرمایہ ہوتی ہے۔ میری اولاد بھی میرا اثاثہ ہے، قیمتی اثاثہ، میری کل متاع جاں۔'' تبھی اُس کی نظر سامنے رُکی ٹھٹکی اور پھر تھم گئی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ یک ٹک دیکھے گئی یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں پانیوں سے بھر کر دھندلی ہو گئیں۔

''کیا ہوا رک کیوں گئیں؟'' بشیراں نے پوچھا۔

''بس کچھ نہیں۔''

''آپ روز اس گھر کے سامنے رُک جاتی ہیں۔ کس کا گھر ہے یہ۔'' بشیراں نے فاخرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کوئی نہیں، تالا لگا ہوا ہے، میرا یہاں کوئی نہیں رہتا۔'' وہ نم آنکھوں کو مسلتی ٹوٹے قدموں سے آگے بڑھ گئی سامنے ہی سرکاری ہائی اسکول کی عمارت نظر آ رہی تھی وہ اسکول میں سینئر ٹیچر تھی۔ پرنسپل اُس کی مشاورت سے اسکول کے ہر کام کیا کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

عروہ نے تیز آواز میں کمپیوٹر پر ''بلما'' لگا رکھا تھا اور بالکل ہیروئن کے انداز میں اسٹیپ لینا سیکھ رہی

تھی۔ بہت دنوں سے اُس کی پریکٹس چل رہی تھی ۔تقریب کا سارا انتظام مس افشاں کررہی تھیں۔عروہ نے کالج کی تقریب میں ڈانس کرنا تھا۔امن نے بھی عروہ کے ساتھ اسٹیج پر ڈانس کرنا تھا وہ دونوں کزن ڈانس میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں۔امن اور عروہ گھر پر اپنے طور پر اکٹھے ڈانس کرکے سیکھتی رہتی تھیں۔وہ تقریب میں اپنی کارکردگی سے نمایاں نظر آنا چاہتی تھیں۔

عروہ اس وقت کمر کو بل دے دے کرناچ رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی، مگر وہ تھرکنے میں اتنی گم تھی کہ اُسے دستک کی آواز سنائی ہی نہیں دی۔ ذرا توقف کے بعد دستک دوبارہ ہوئی۔عروہ کا دھیان بٹ گیا اور اُس کے پاؤں تھم گئے۔

''کون؟'' عروہ نے درشتی سے پوچھا۔

''امن، دروازہ کھولو۔''

''آؤ، اتنی دیر لگادی۔'' عروہ نے امن کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا اور اندر سے دوبارہ کنڈی لگادی۔

''تمہاری مما کہاں ہیں۔'' امن نے پوچھا۔ نجانے اُسے امن کی مما (تائی جان) سے ڈر کیوں لگتا تھا، عجیب منہ پھٹ سی تھیں۔ پل میں اگلے کو بے عزت کرکے رکھ دیتی تھیں۔

''اپنے دورے پر نکلی ہیں بے فکر ہو۔'' عروہ نے لاپروائی سے کہا اور امن کو آنکھ ماری اور پھر دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

''میری مما آنے نہیں دے رہی تھیں۔ میں بہت مشکل سے بہانے بنا بنا کر آئی ہوں۔''

''چل چھوڑ، اپنی اور میری مما کو، اتنے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈانس ہی سیکھنا ہے نا کوئی فلموں میں تو کام کرنے نہیں جارہیں ہم دونوں۔'' عروہ ایسی ہی تھی۔ لاپروا من موجی، کسی کی نہیں سنتی تھی۔

''دراصل یار میں نے مما کو بتایا نہیں ہے نا کہ مجھے کالج فنکشن میں ڈانس کرنا ہے، چوری چھپے حصہ لے لیا، میری مما کو جانتی تو ہو کہ ذرا سخت طبیعت کی ہیں۔''

''چل چھوڑ! پراں کر ساری فکریں۔'' کہتے ہی عروہ نے ایک بار پھر 'بلما' تیز آواز میں لگادیا۔عروہ تو خیر سرے سے اپنی ماں کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ امن اپنی مما سے ذرا سا ڈرتی تھی مگر اس وقت بلما کی چھنک اور سُر میں وہ بھی سارے ڈر اور خوف دل سے نکال چکی تھی۔

''اُووف تھک گئی۔'' امن نے پنکھا فل اسپیڈ میں چلایا اور صوفے پر بے دم ہوکر گرگئی۔ اُس کی پوری قمیض پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ وہ تھک چکی تھی مگر لگن ابھی باقی تھی۔ یہی حال عروہ کا تھا دونوں ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے۔ تھری سیٹر صوفے پر وہ دونوں بڑی ہانپ رہی تھیں۔

''پھر ناچیں۔'' ذرا سی سانس بحال ہوئی تو عروہ نے پوچھا مگر امن نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر انکار کردیا۔

''نہیں یار ذرا بھی سکت نہیں، کل آؤں گی۔'' امن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ باہر نکلی تو دیکھا فروا اپنے سامنے پالک کا ڈھیر لگائے خود کسی سے فون پر باتیں کررہی تھی۔

''ہیلو فروا آپی کیسی ہو؟'' امن فروا کو سامنے پاکر بوکھلا گئی۔ وہ بھی تائی جان جیسی ہی تھی۔

''ہوگیا ناچ گانا۔'' فروا نے خشمگیں نگاہوں سے امن کو گھورا، وہ سٹپٹا گئی۔ اُس کو خدشہ لاحق ہوا کہیں فروا اُس کی مما کو نا بتادے یہ سوچ کر امن کے اوسان خطا ہونے لگے۔

''میں چلتی ہوں۔'' وہ فروا کی گھورتی نظروں سے خائف ہوکر بھاگی۔

''اپنی ماں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا خوب سیکھ گئی ہو۔'' وہ طنز سے باز نہیں آسکتی تھی۔ امن جانتی تھی کہ فروا کا عروہ پر تو بس نہیں چلتا تھا مگر امن کو جلی کٹی سنانے پر تلی رہتی تھی اور امن دوبدو جواب نہیں دیتی تھی

کچھ بھی تھا اتنا لحاظ مروت تو بہر طور اُس میں تھا۔

☆......☆......☆

عروہ اور امن کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں ہم عمر، ہم مزاج ہی نہیں کلاس فیلو بھی تھیں۔ بہاولپور شہر کی مل والی گلی کی رہائشی یہ دونوں کزن ایک پرائیویٹ کالج میں 'آئی کام' فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹس تھیں۔ کالج میں اُن دونوں کی دوستی ضویا سے ہوگئی جو کسی گاؤں سے پڑھنے کالج میں آتی تھی۔ یہ تینوں کالج میں ہر وقت اکٹھی نظر آتی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے مگر کالج میں لڑکے اور لڑکیوں کو آپس میں بہت زیادہ بات چیت کرنے کی اجازت تو نہیں تھی۔ گھلنا ملنا تو درکنار، بس سب اسٹوڈنٹس اسٹڈی کے متعلق بات کر لیتے تھے۔ لیکچر کے حوالے سے ڈسکشن ہوتی تھی۔

مگر کھلم کھلا گھومنا پھرنا یا عامیانہ گفتگو کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ پھر بھی بہت سارے لڑکے لڑکیوں نے خفیہ دوستیاں گانٹھ رکھی تھیں۔

دونوں ہی واجبی سی شکل و صورت کی تھیں۔ پڑھائی میں بھی بس اتنی ہی اچھی تھیں کہ پاسنگ مارکس لے لیتی تھیں، اُن کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

اُس دن جب جھلسا دینے والی دھوپ نے اُن کی رنگت جھلسا کر رکھ دی تھی۔ سورج بادشاہ اپنی پوری آب و تاب اور طمطراق سے اُن پر سایہ فگن تھا۔ عروہ اور امن نے اپنی فائلز کا چھجا سا بنا کر آنکھوں پر تان رکھا تھا وہ کینٹین جا رہی تھیں۔

''میں نے تو صبح بھی ڈھنگ سے ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس وقت شدید بھوک لگی ہے۔'' عروہ نے بے چاری سی شکل کو مزید بسور کر کہا۔

''ہاں صبح صبح دل بھی نہیں چاہتا اور بھائی نے اتنا شور مچا رکھا ہوتا ہے کہ بس ایک کپ چائے پر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔'' ضویا نے بھی اپنا مسئلہ بتایا۔

''میں تو ناشتا کر کے ہی آتی ہوں۔ میری ماما مجھے کبھی بھوکا نہیں آنے دیتیں۔'' امن نے کہا۔

''اچھا آؤ! میری تو جان نکلی جا رہی ہے بھوک سے۔'' عروہ نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔

''تم تو ہر وقت بھوک بھوک ہی کرتی رہتی ہو۔'' ضویا نے مذاق اُڑایا۔

عروہ نے اُسے غصے سے گھورا مگر بولی کچھ نہیں کیونکہ وہ حقیقتاً بھوک سے ادھ موئی ہو رہی تھی۔

ضویا چلتے چلتے رُکی اور اپنے بیگ کی زپ کھول کر اُس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ ساتھ ہی بیگ میں منہ گھسا لیا۔ عروہ نے اُسے بیچ راستے میں رُکے دیکھا تو اُسے تپ چڑھ گئی۔

''کیا ہے! یہ احمقوں والی حرکتیں بند کرو۔'' عروہ نے اُسے ٹہوکا دیا مگر اُس نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ تلاش بسیار کا کام ہنوز جاری رکھا، نجانے بیگ میں ایسا کیا گم کر بیٹھی تھی جو ملنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''مل گیا۔'' تبھی ضویا چلائی اُس کی مطلوبہ چیز مل چکی تھی۔

''بدھو کہیں کی۔'' عروہ نے اُسے گھر کا، کیونکہ اُسے ضویا کی یہ حرکات و سکنات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ اکثر لاپروائی سے بیگ میں سیل فون ٹھونس دیتی تھی پھر مل کے ہی نہیں دیتا تھا۔

''ہزار بار کہا ہے کہ اندر کی پاکٹ میں سیل فون رکھ لیا کرو، عمرو عیار کی زنبیل جیسا بیگ ہے تمہارا، جس میں زمانے بھر کا الم غلم بھرے رکھتی ہو پھر اُسی میں سیل فون پھینک کر گم کر لیتی ہو۔ اپنا بھی وقت برباد کرتی ہو اور ہمارا بھی، وہی رہنا بے وقوف گاؤں کی گوری۔'' امن نے بھی اُس کو پہلے ڈپٹا اور بعد میں اُس کا تمسخر بھی اُڑا ڈالا۔

''بلکہ یوں کہو امن گاؤں کی کالی۔'' عروہ بھی ہنسی۔

''ہاں تم دونوں تو حسینہ عالم ہو، پریاں ہو اور شہر کی شہزادیاں ہو۔'' وہ بھی دوبدو بولی تو سب ہنسنے لگیں۔

کینٹین پر آ چکی تھیں وہ۔

''تین پلیٹ سموسے اور تین کوک اسٹرا سمیت۔'' عروہ نے کینٹین والے لڑکے کو آرڈر دیا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ مستعدی سے کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

ذرا دیر بعد وہ تینوں سموسوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ بے فکری اور لا اُبالی پن کی شوخ ہنسی، جو اس عمر کا خاصا ہوتی ہے، بے وجہ ہنسی آتی ہے اور بے حد زوروں کی ہنسی آتی ہے۔ ایسی ہنسی جو دل سے شگوفوں کی مانند پھوٹتی ہے۔ رُکتی نہیں آ ئے چلی جاتی ہے۔

☆......☆......☆

یہ گھر فرقان احمد کا ہے۔ اچھا پختہ بنا ہوا گھر اُن کی جنت ہے۔ اُن کی بیوی لبنیٰ میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو اچھی بیوی اور اچھی ماں میں ہوتی ہیں۔

اُن کی بیٹی امن، بیٹے ہنزلہ اور حذیفہ اُن کی زندگی ہیں۔ اُن کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ لبنیٰ سمجھدار اور معاملہ فہم ہیں، کچھ پڑھی لکھی باشعور بھی ہیں۔ اُن کو محلے میں اس وجہ سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ خدا ترس خاتون بھی ہیں۔

اس وقت لبنیٰ دیوار کے ڈھلتے سائے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ امن پاس ہی دوسری چارپائی پر اپنی کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ ہنزلہ اور حذیفہ اس وقت ٹیوشن سینٹر گئے ہوئے تھے۔

امن ابھی واش روم سے نہا کر آئی تھی۔ اُس نے بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ لبنیٰ نے اُٹھ کر دروازہ کھولا سامنے فروا کھڑی تھی۔ امن نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر لبنیٰ کے کندھے سے جھانکا ہنستی مسکراتی فروا پر نظر پڑتے ہی امن کا رنگ فق ہو گیا۔ سانولی رنگت متغیر ہو کر سیاہ نظر آنے لگی۔ لبنیٰ پرتپاک انداز میں فروا کو گلے ملی اور اندر آنے کی جگہ دی۔

''کیسی ہیں آپ چاچی۔'' فروا نے نظریں امن پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ جتاتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر امن سٹپٹا کر رہ گئی دائیں بائیں دیکھنے لگی مگر دل کا خوف دائیں بائیں نہ ہو سکا۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا، تم سناؤ۔'' لبنیٰ نے خوشدلی سے پوچھا۔ فروا نے بتایا کہ وہ بھی ٹھیک ہے۔ فروا نے اپنا لان کا دوپٹہ اُتار کر گول مول کر کے اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ صاف کیا۔

''میں سکنجبین بنا کر لاتی ہوں۔'' امن بہانے سے غائب ہو گئی۔

''آپ تو آتی ہی نہیں ہیں، میں نے سوچا کہ میں ہی مل آؤں چاچی سے۔''

''اچھا کیا بیٹا تم چلی آئیں، بس میں تو گھر داری میں ہی اُلجھی رہتی ہوں۔ چاہ کر بھی نکلنا نہیں ہوتا۔'' لبنیٰ نے انکساری سے نہ آنے کی وضاحت بھی دے ڈالی۔

امن سکنجبین بنا کر لے آئی جگ اور گلاس لبنیٰ کے پاس رکھے اور جان بوجھ کر دوبارہ کچن میں جا گھسی جاتے جاتے اپنا 'کام' کر گئی تھی۔ لبنیٰ کے چہرے کے تاثرات یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

فرقان احمد کا شہر کے وسط میں جنرل اسٹور تھا۔ وہ علی الصبح اسٹور پر جایا کرتا تھا۔ اچھا چلتا ہوا اسٹور تھا۔ رات دیر تک بارش ہوتی رہی تھی۔ موسم بے حد سہانا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

''فرقان اُٹھ جائیں نماز کا وقت نکل جائے گا۔'' لبنیٰ نے بیڈ کے سرہانے بیٹھ کر اُن کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، بال سہلانے لگی پھر ہاتھ فرقان کی پیشانی پر آن رکا۔

''بارش رُک گئی کیا؟'' فرقان نے لبنیٰ کے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ کر لبوں پر رکھ لیا۔

''جی رُک گئی۔''

"کپڑے استری کر دیے۔"

"جی رات کو ہی کر کے رکھ دیے تھے بلکہ جوتے بھی پالش کر کے رکھ دیے تھے۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا اب اُٹھ جائیں نماز پڑھ لیں۔" لبنیٰ اُٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ بیٹھی رہی تو فرقان یوں ہی کسلمندی سے لیٹے رہیں گے نماز نہیں پڑھیں گے۔"

"اچھا جی بیگم صاحبہ!" وہ اُٹھ کر سلیپر پہننے لگے۔

☆......☆......☆

فرقان جلدی ناشتا کر کے اسٹور پر چلے گئے لبنیٰ اب امن اور حذیفہ و ہنزلہ کے لیے سلائس تل رہی تھیں۔ امن اور ہنزلہ ہر چیز چپ چاپ کھالیتے تھے جبکہ حذیفہ بہت نخرے کرتا تھا، شرارتی بھی بلا کا تھا۔

"امن میں ٹیبل لگاتی ہوں تم پلیز بیٹا حذیفہ کو دیکھو جا کر۔ ابھی تک نہیں اُٹھا، جاگنے میں بہت وقت لیتا ہے۔" لبنیٰ بڑبڑاتی ہوئی ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات رکھنے لگی۔

"وہ اُٹھ گیا ہے مما، واش روم میں ہے۔" امن کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے کچھ بھی مت چھپایا کرو امن۔" امن سلائس پر جیم لگا کر مزے سے کھا رہی تھی۔ لبنیٰ کی بات پر اُس کا ہاتھ وہیں رُک گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

"تم کالج کے فنکشن میں ڈانس کر رہی ہو۔" لبنیٰ کی بات پر امن نے دانتوں تلے اُنگلی دبائی جس بات کا ڈر تھا وہی مجسم ہو کر سوال بن گیا تھا۔

"وہ مما، وہ......" امن ہکلا رہی تھی۔ کوئی مناسب بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ اچانک پکڑی گئی تھی۔

"زندگی میں صرف پہلی بار جھوٹ بولنا مشکل لگتا ہے پھر انسان عادی ہو جاتا ہے۔ بیٹا زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولنا ورنہ اپنا اعتبار کھو دو گی۔ سچ بھی بولو گی تو بھی کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور ماں سے تو کبھی بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اور نہ کوئی بات چھپانی چاہیے۔ ماں سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا۔" لبنیٰ نے سرزنش کی تھی یا کوئی وارننگ، امن کی سمجھ سے بالاتر تھا ہاں یہ ضرور ہوا کہ اُس نے کوئی عذر نہیں تراشا بس پریشان سی نظر آنے لگی۔

"بیٹی کے بارے میں کوئی بات یا اطلاع ماں کو بیٹی کے بجائے کوئی باہر کا بندہ دے تب کتنی شرمندگی اور خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ بیٹا یہ یاد رکھنا بات کتنی ہی معمولی نوعیت کی کیوں نہ ہو گھر کے اندر مت چھپانا۔"

لبنیٰ نے ماں کا فرض ادا کرتے ہوئے رسانیت سے امن کو سمجھایا۔ وہ سمجھی یا نہیں اُس کا دوبارہ اس نصیحت پر عمل کرنے کا ارادہ تھا یا نہیں مگر فی الوقت اُس نے یوں سر جھکا دیا تھا جیسے وہ ندامت میں ڈوبی سر اٹھا نہیں پا رہی ہو۔

"سوری مما۔"

"ٹھیک ہے مگر دوبارہ خیال رکھنا۔ لڑکیوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں (جو جانے انجانے میں اُن سے سرزد ہو جاتی ہیں) بعض اوقات اُن کو بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیتی ہیں۔" امن نے اپنی کتابیں، فائل سیٹ کیں، اپنا بیگ اُٹھایا اور لبنیٰ کی بات کو بے توجہی سے سنتی باہر نکلی۔ اُسے یہ خواہش ہی نہیں تھی کہ وہ لبنیٰ کی بات دھیان سے سنے اور پھر اُن باتوں سے معنیٰ اور نتیجے اخذ کرے اور آنے والے دنوں میں اُن پر عمل بھی کرے۔ وہ تو لمبی چوڑی ڈانٹ یا لیکچر سے بچ جانے پر خوش تھی۔

"مما میں جا رہی ہوں۔" امن نے دوپٹا اچھی طرح سر پر جما کر کہا۔

"اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا۔" لبنیٰ نے آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی اور تا دیر محویت سے امن کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ دلہیز پار بھی کر گئی مگر لبنیٰ دروازے کو ہی دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

اس وقت بھی وہ تینوں کالج گراؤنڈ میں اکٹھی بیٹھی تھیں گرمی آج بھی زوروں کی تھی۔

''ضوبیا سوٹ کا کیا فیصلہ کیا، مطلب فنکشن میں کیسا سوٹ پہنو گی۔'' عروہ نے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پاس سادہ سے چند جوڑے ہیں بس۔'' ضوبیا نے سادگی سے کہا۔

''یار پلیز کوئی سادہ سا جوڑا پہن کر نہ آجانا۔'' عروہ نے اُس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے کیونکہ ضوبیا کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اس لیے وہ اسٹائلش جوڑے نہ ہی بنوا سکتی تھی اور نہ ہی وہ کریزی تھی ایسی چیزوں کو لے کر۔

''میری آپی کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اُن کا جوڑا پہن لوں گی، ڈونٹ وری۔ مجھے دوست کہتے تمہاری شان میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔'' ضوبیا اسٹیٹس کانشس نہیں تھی۔ کوئی کیا سمجھتا ہے، کیا کہتا ہے اُسے کبھی بھی قطعی کوئی پروانہیں ہوتی تھی وہ جیسی تھی ویسی نظر بھی آتی تھی، پیچھے نہیں بھاگتی تھی چیزوں کے، لوگوں کے یا جھوٹے خوابوں کے۔

''امن تم کیا پہنو گی۔''

''میں اپنی مما سے کہوں گی ضرور کہ نیا سوٹ دلوادیں مگر یہ بھی امکان ہے کہ وہ مجھے 'قناعت' پر لمبا چوڑا لیکچر دینے لگیں مگر ہوسکتا ہے سوٹ دلوا ہی دیں۔''

''میں تو بوتیک سے نیا سوٹ لوں گی اپنی مما سے، بھلے ضد ہی کرنی پڑے۔'' عروہ نے آنکھوں کو گول گول گھما کر زعم سے کہا۔ اس سے اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اُسے اپنی بات منوالینے کا یقین ہی نہیں بلکہ 'زعم' بھی ہو۔

''ویسے عروہ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' امن نے کندھے اُچکا کر تجسس پھیلایا۔

''کس بات کی؟'' ضوبیا اور عروہ نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''یہی کہ تمہاری آنکھیں کیسی ہیں عجیب سی۔'' امن نے کہا اور عروہ کو منہ چڑاتی اپنی کتابیں اور بیگ وہیں چھوڑ کر اُٹھ کر بھاگی۔ اُسے پتا تھا عروہ پہلے شپٹائے گی پھر امن کو مار ڈالے گی۔

''ناک بھی چپٹی ہے۔'' امن جاتے جاتے بولی۔ عروہ اُس کے پیچھے بھاگی تھی۔ ابھی تو وہ نئے سوٹ کی جھلملاہٹوں میں گم تھی کہ امن نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ خوابوں کی وادیوں سے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

''تم تو جیسے حور پری ہونا، لیڈی ڈیانا جیسا فگر، مونالیزا جیسی مسکراہٹ ہے نا۔'' وہ مسلسل امن کے پیچھے بھاگ رہی تھی مگر وہ پکڑائی میں ہی نہیں آرہی تھی، تبھی وہ زور سے کسی سے ٹکرائی تھی۔ دن میں تارے کیسے نظر آتے ہیں امن کو لگ پتا گیا تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے گرلز، چلیں اپنی اپنی کلاسز میں۔'' سامنے بی کام کا سی آر نیہات ضمیر تھا وہ اُن کو ڈپٹ رہا تھا۔ امن نیہات ضمیر سے ہی ٹکرائی تھی۔

''آپ لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے۔ بی میچور گرلز، یہ اُچھل کود، یہ بھاگ دوڑ، فضول کے قہقہے بہت بچکانہ حرکتیں ہیں ویری سیڈ۔'' وہ تو شروع ہی ہو گیا تھا۔ لعنت ملامت کرنے پر تو یوں تل گیا تھا جیسے نجانے اُن دونوں سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

وہ انہیں برا بھلا کہتا وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ وہ دونوں گم صم کھڑی ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔

''جہاں بھی جاتے ہیں بے عزت ہی ہوتے ہیں اور یہ ضوبیا ضمیر کا بھائی نیہات ضمیر سڑیل، کھڑوس، پتا نہیں کہاں سے ٹپک پڑتا ہے۔ مجال ہے ذرا ہلا گلا کرنے دے۔''

''اچھا یار معاف کردے میں نے تمہیں گول

آنکھوں والی چپٹی ناک والی کہا۔'' امن چہرے پر بے چارگی و مسکینی سجا کر چاپلوسی کرنے لگی بلکہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے وہ پہلے ہی نیہات کے ہاتھوں خوار ہو چکی تھی۔

''تم تو مس کترینہ کیف ہو پراں دفع ہو۔'' عروہ نے اُس کے بندھے ہاتھ جھٹکے اور تن فن کرتی یہ جا وہ جا۔

امن کو ماننا پڑا کہ آج کا دن بے عزت ہونے کا دن تھا۔

لبنیٰ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی اُس کا ارادہ آج بازار جانے کا تھا۔ امن نے بہت لجاجت و منت بھرے انداز میں نئے سوٹ کا تقاضا کیا تھا، لاڈ سے عاجزی سے اور لبنیٰ نے حامی بھرلی تھی۔ اس سے پہلے کہ امن ضد کرتی۔ لبنیٰ جو کم ہی اکیلی بازار جایا کرتی تھی مگر کچھ سوچ کر گھر سے چادر اوڑھ کر نکلی اور زمان بھائی کے گھر چلی گئی۔

☆......☆......☆

دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔ لبنیٰ ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''السلام وعلیکم!'' زینت گھر کی صفائی کر رہی تھی لبنیٰ پر نظر پڑی تو اِدھر آ گئی۔

''وعلیکم السلام، بھابی عائشہ کہاں ہیں۔''

''وہ تو گھر نہیں ہیں، کہیں باہر گئی ہیں۔'' زینت کل وقتی ملازمہ تھی اس لیے گھر میں اُس کی کافی عزت تھی اور اُسے گھریلو معاملات کے بارے میں پتا ہوتا تھا۔

''کچھ پتا ہوگا کس کے گھر گئی ہیں۔'' لبنیٰ نے بیزاری سے پوچھا اُسے عائشہ بھابی کی گھر گھر پھرنے والی عادت سے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔

''پتا نہیں جی۔''

''فروا بی بی کو جگا دوں۔'' زینت کہہ کر لبنیٰ کو دیکھنے لگی کہ وہ کیا جواب دیتی ہیں۔

''نہیں رہنے دو، ویسے یہ آج پارلر کیوں نہیں گئی۔''

''پتا نہیں جی، ناشتے کے لیے زمان صاحب نے بلوایا تھا تو اُس نے دروازے کے اندر سے ہی کہہ دیا کہ موڈ نہیں ہے پھر زمان صاحب نے کہہ دیا کہ جب اُس کا دل چاہے گا اٹھ جائے گی اور جب تک جی چاہے وہ سوئے۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں پھر، بھابی کو بتا دینا۔'' یہ کہہ کر لبنیٰ بازار چلی گئی۔

امن کے لیے لبنیٰ نے ایک اسٹائلش سا سوٹ لیا۔ میچنگ شوز بھی لے لیے، چھوٹی موٹی چیزیں اور گھریلو ضروریات کی چیزیں لے کر وہ سبزی لے رہی تھی جب کوئی اُس کے پاس آ کر رُکا تھا۔ لبنیٰ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں گلے مل کر زارو قطار رونے لگیں تھیں۔ حال احوال بھی نہیں پوچھا تھا حال چھپا ہوا تو نہیں تھا۔

دونوں کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنے اطراف سے بے خبر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ تبھی بشیراں نے اُن کو الگ کیا اور احساس دلایا کہ بازار میں سب لوگ اُن کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، کچھ لوگ تو اُن کے پاس آ کر پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے خیریت تو ہے نا، اُن دونوں نے بروقت خود کو سنبھالا اور آنسو صاف کر لیے۔

''کیا ہوا ہے بہن، کوئی مر گیا ہے یا چوری وغیرہ ہو گئی ہے؟'' اُس اجنبی خاتون کی نگاہوں میں بیک وقت ترحم بھی تھا شک و شبہات بھی۔

''کچھ نہیں ہوا، پرانی سہیلیاں ہیں عرصے بعد ملی ہیں تو آبدیدہ ہو گئیں۔''

''بشیراں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو وہ عورت ناک بھوں چڑھاتی پلٹ گئی لوگوں کا مجمع بھی چھٹ گیا اور سب معمول کے مطابق اپنے کاموں میں دوبارہ منہمک ہو گئے تھے۔

''کیسی ہو فاخرہ؟'' لبنیٰ نے چادر کے پلو سے آنکھیں مسلتے ہوئے پوچھا۔

''کیسی ہو سکتی ہوں میں۔'' فاخرہ کی سوز میں ڈوبی

بات پر لبنیٰ کچھ لمحوں کے لیے بس گم سی ہوگئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ تسلی و تشفی یا کسی کو دلاسہ دینے کے لیے لفظ ڈھونڈنے کے لیے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مگر مقابل کا دُکھ، اُس کا صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس درد کے مداوے کے لیے لفظ بہت چھوٹے۔

''تم کیسی ہو لبنیٰ، میں تو 'اپنوں' کی شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ تمہیں دیکھا تو خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ نجانے میری آزمائش کب ختم ہوگی، ہوگی بھی یا نہیں۔'' عبایا میں چھپا اُس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اُس کے لہجے کا اضطراب لبنیٰ کے دل میں گڑھ گیا تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا فاخرہ، اللہ تعالیٰ کبھی بھی بندے کو اُس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، سب وسوسے اور خدشے دل سے نکال دو۔'' فاخرہ اذیت سے مسکرائی۔

''میں ہر رشتے کی مجرم ہوں لبنیٰ، کوئی بھی مجھ سے کبھی خوش نہیں رہا حالانکہ بہت سے لوگ میری زندگی میں ایسے بھی ہیں جن کو خوش رکھنے کی کوشش میں، میں ہلکان ہو رہی ہوں۔ اپنا آپ مٹا رہی ہوں مگر میری خطائیں شاید اتنی زیادہ کہ سزائیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ میں نے سدھارنے کے لیے بہت جتن کیے مگر میرا سفر ختم ہی نہیں ہوتا اور کوئی آس بھی نہیں کہ سفر کی تھکن بھری طوالت کے دوسرے کنارے پر کوئی سکھ، عزت، یا بچی کچھی محبت میرے حصے کی منتظر ہے۔'' اُس کی سانس پھولنے لگی۔

''میرے پاؤں اس آبلہ پائی کے سفر میں درد کی منزلیں طے کرتے تھک گئے ہیں۔ اذیت بھری مسافت نے میرا دل فگار کر ڈالا ہے۔ میں نے اب دوسروں کے ڈر خوف کو دل سے نکال دیا ہے۔ میرے بچے میری ڈھال بن جائیں تو مجھے سکھ مل جائے مگر میرا دل لرزتا ہے، یہ سوچ کر کہ اگر بچوں نے بھی میرے آگے سوال رکھ دیے تو کیا کروں گی۔ کیسے سامنا کروں گی ان کی ملامت بھری نظروں کا۔'' فاخرہ کا دل اس سے صرف ماں کا دل بنا کرب سے گزر رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو، تمہاری بیٹیاں کوئی سوال نہیں کریں گی۔ وہ تمہاری درد آشنا بنیں گی۔''

''میں اب صرف 'ماں' بن کر زندہ رہ رہی ہوں۔ میری اولاد میری مضبوطی ہے۔ لبنیٰ تم دعا کرنا میرے حق میں کہ میں کم از کم اپنی اولاد کی نظروں میں ہی سرخرو ہو جاؤں۔ وہ ہی مجھے معتبر کر دیں، ہم کوشش کرتے ہیں مگر کبھی کبھی نتائج ہمارے ارادوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانچ پڑتال کرتے بہت سا وقت گزر گیا۔ پچھتاووں کی آگ میں جل جل کر گزار دیے اتنے سال مگر نہ ملال کم ہوا اور نہ ہی ندامت۔'' لبنیٰ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی کزن فاخرہ کے دکھ، اذیت اور تکلیف کو دل سے محسوس کرتی تھی مگر بہت سارے معاملوں میں مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ شروع شروع میں لبنیٰ نے فرقان، زمان، رحمان اور اپنی ساس کو سمجھانے اور احساس دلانے کی کوشش کی تھی مگر سب بے سود تھا۔ اُسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔ اُس کی بات ماننا تو درکنار کسی نے فاخرہ کے حوالے سے اُس کی بات سننا بھی گوارا نہیں کی تھی۔ پھر آخر کار لبنیٰ نے فاخرہ کی زندگی کے سارے معاملے اللہ پر چھوڑ دیے تھے اور اپنی سسرالی فیملی کو سمجھانے کی کوشش ترک کر دی تھی کیونکہ یہ سب خدا بن گئے تھے۔ فاخرہ کی قسمت کے فیصلے خود کرنے لگے، سزا دینے لگے، سزا تجویز کرنے لگے بھول گئے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

''اچھا میں چلتی ہوں، بچوں کو پیار دینا لبنیٰ۔''

فاخرہ نے لبنیٰ کو سوچوں کے بھنور سے نکالا۔ دونوں بھینچ بھینچ کر گلے ملیں، پھر وہ چلی گئی۔ ایک وقت تھا جب وہ دونوں گہری دوست ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج ایک دوسرے کو ملنے کو ترستی تھیں۔

اے محبت تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے

ہم سے منہ زور کمالات کیا کرتے تھے
خشک مٹی کو عمارات کیا کرتے تھے
اے محبت یہ تیرا بخت کہ بن مول ملے
ہم سے انمول جو ہیروں میں تلاش کرتے تھے
اور اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں
خلقت شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے

لبنیٰ کی آنکھوں سے آنسو نہیں یادیں بہہ رہی تھیں۔ فاخرہ کی بے وقعتی، اُس کی بے قدری پر اُس کا دل ہمیشہ کٹتا تھا مگر اُس کے بس میں کیا تھا۔ اُن کو ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی، دکھ سکھ بانٹنا تو دور کی بات تھی۔ بہت سی یادوں کے منہ کھل گئے تھے۔

لبنیٰ دل گرفتہ سی گھر لوٹی تھی۔

☆......☆......☆

''چل معاف کردے نا، تُو میری اچھی بہن ہے نا۔'' امن اس وقت اپنی چھت پر کھڑی عروہ کی چھت پر جھانکتے ہوئے کہا۔ شام کا وقت تھا عروہ چھت پر چارپائیاں بچھا رہی تھی۔ یہ لوگ چھت پر سوتے تھے۔ مگر عروہ نے پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا بس اپنا کام کرتی رہی۔

''عروہ سُن نا، اِدھر دیکھ نا میری طرف چھپکلی'' امن نے آخری لفظ دانتوں تلے دبا کر کہا۔ عروہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور ذرا سا درمیانی فاصلہ گھٹا کر امن کے سامنے آن رُکی مگر چہرے پر غصہ نظر آ رہا تھا۔

''ہاں بول، کیا ہے۔''

''معاف کردے، میں نہیں رہ سکتی نا تمہارے بنا، دوستوں میں ہنسی مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے یار! اتنا برا ماننے کی بھلا کیا تک ہے۔'' وہ جلدی جلدی بول گئی۔

''چل ٹھیک ہے، یہ بتا تیرا سوٹ سل گیا۔'' عروہ نے نروٹھے پن سے کہا تو امن نے فضائی کس اُس کی طرف اچھالی۔ مقصد عروہ کا موڈ ٹھیک کرنا تھا۔

''ہاں مما نے سی دیا ہے، گلابی رنگ کی لونگ شرٹ اور فیروزی پاجامہ ہے۔ نگوں اور موتیوں کا ہلکا ہلکا کام ہے، شوز بھی ہائی ہیل میچنگ۔'' امن کے دمکتے خوشی کے تمتماتے چہرے پر رنگ ہی رنگ تھے۔

''واہ کیا بات ہے۔ اس بار تمہاری مما نے تمہیں قناعت پر سبق نہیں پڑھایا۔''

''بس مما فضول خرچی کو پسند نہیں کرتیں نا اس لیے ورنہ تو وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''خاک محبت کرتی ہیں۔ ہر وقت روک ٹوک، یہ نا کرو وہ نہ کرو، یہاں نہ بیٹھو وہاں نہ بیٹھو، میری مما کو دیکھو۔ کبھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جہاں دل چاہے جاتی ہوں۔ جو جی چاہے کرتی ہو، تو بھی اپنی ہر بات چاچی سے منوایا کر 'ضد' کر کے۔'' وہ اُسے اُکسا رہی تھی۔

''میں اپنی مما سے ''ضدیں'' نہیں لگا سکتی۔''

''چلو ترستی رہنا ساری عمر، اچھی بو بو بن کر گزار دینا زندگی'' وہ ہاتھ جھاڑ کر بولی جیسے کہہ رہی ہو قصہ ختم۔

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم کیا پہن رہی ہو؟'' امن کی آواز میں دبا دبا جوش اور اشتیاق جھلکا۔

''سی گرین فراک پیور دبکے کے کام والا۔''

''اچھا وہی جیسا فروا کا ریڈ ہے۔'' امن دیوار پر کہنیاں ٹکا کر ذرا سا آگے جھکی۔

''اچھا پھر تم نے نیا سوٹ نہیں خریدا پھر۔''

''خریدا ہے، وہ گھر سے پہن کر جاؤں گی اور سی گرین فراک ڈانس کرتے ہوئے پہنوں گی۔'' عروہ اترائی۔

''اچھا یار تم اپنے فراک کے ساتھ وہ فروا کا ریڈ والا بھی ساتھ لے جانا پلیز میرے لیے۔''

''نا بابا فروا نہیں دیتی اپنی چیزیں، اور وہ فراک تو ہے بھی بہت قیمتی۔''

''مانگنے کی ضرورت بھی کیا ہے فروا سے، چوری لے آنا، پلیز میری خاطر۔'' امن ندیدوں کی طرح بولی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' عروہ نے احسان کرتے

ہوئے کہا۔
''بہت بڑا تھینکس۔'' امن اُس ریڈ دبکے والے شیفون کے فراک کی جھلملاہٹوں میں کھوگئی۔

☆.......☆.......☆

کالج بہت بڑا نہ ہونے کی وجہ سے کالج فنکشن کا اہتمام ایک ہوٹل کے ہال میں تھا۔ امن اور عروہ نے منتیں کرکر کے فروا سے میک اپ کروایا تھا۔ فروا نے لاکھ نخرے کیے مگر صد شکر کہ اُن کا میک اپ کر دیا تھا اور جب وہ کالج کے لیے نکلنے لگیں تب فروا نے امن کو اپنا پنک پاؤچ بھی دیا اور حیرت کا مقام تھا کہ بن مانگے ہی دیا تھا۔ امن نے فروا کو ہونٹ سکوڑ کر یوں اشارہ دیا جیسے مشکور ہوکر اُسے کس کر رہی ہو۔
''میں بھی چلتی ہوں۔'' فروا نے کہا تو اُس نے چونک کر دیکھا۔
''سیلون تک۔'' فروا نے کہا تو اُن کی اٹکی سانسیں بحال ہوئیں۔
''اوہ اچھا۔'' دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فروا کا سوٹ وہ چوری سے لے کر جارہی تھیں فروا کے ساتھ فنکشن میں جانے کی وجہ سے بھانڈا پھوٹ جاتا۔ شکر ہے خیر گزری۔
وہ ہوٹل میں داخل ہوئیں تو ہوٹل کی انٹرنس میں ہی نیہات ضمیر اور ضویا ضمیر کھڑے مل گئے۔ فروا پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ نیہات نے گہری نظروں سے امن کو دیکھا۔ گلابی لونگ شرٹ، فیروزی پاجامہ، لمبے گھنے بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ فرنٹ سے بالوں کا بینڈ اسٹائل بنا رکھا تھا جس کی وجہ سے امن کا چہرہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔ وہ بہت حسین تو نہیں تھی مگر پُرکشش تھی اور کم عمری کی سحر انگیز نوخیزی توجہ کھینچ لیتی تھی نیہات محویت سے اُسے تکتا رہا، وہ متوجہ نہیں تھی۔ ضویا سے باتوں میں مگن تھی، ہنسی مسکراتی، اٹھلاتی' دوپٹہ کندھے پر جھول رہا تھا۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا، نیہات کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور امن کو دیکھے۔ انہماک سے توجہ اور پھر دلچسپی سے۔
''چلو اندر جاؤ رش بڑھ رہا ہے۔'' وہ ایک دم روکھے پھیکے انداز میں بولا۔
''ضویا، امن چلو۔'' اب کے بار درشتی سے بھرپور لہجہ تھا۔
''ایک تو یہ تمہارا بھائی بھی نا، ہر وقت ڈانٹتا ہی رہتا ہے۔'' امن نے منہ بگاڑا۔
''سی آر ہے نا نیہات بھائی، نمائندہ ہیں وہ؟''
''اپنی کلاس کے ہیں، پورے کالج کے نہیں اور ویسے بھی آج تو ہم کالج میں ہیں بھی نہیں۔''
''اچھا چھوڑو، آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔''
''تم بھی بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔'' امن نے بھی ضویا کی تعریف کی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی قابل ہی نہیں بہت اچھے بھی تھے۔ بظاہر دیکھنے میں بھی دلکش تھے۔
ہال میں جاکر عروہ نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اپنا چہرہ آئینے کے سامنے کرکے آنکھیں پھیلا کر کبھی سکیڑ کر خود کو ہر زاویے سے دیکھا۔ آئینے نے جھوٹ بول کر ایک خوش فہمی اسے تھمائی کہ آج حسین ترین لگ رہی ہو۔ ہاں وہ معمول کے دنوں کی نسبت آج قدرے اچھی لگ رہی تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ اُس کا حسن قیامت خیز دکھائی دے رہا تھا اور دیکھنے والی نظر کو اسیر کرکے راہ چلتوں کو رک جانے پر مجبور کردے۔ نگاہوں کو خیرہ کردے، مبہوت کرکے اردگرد سے بیگانہ کرڈالے، مگر عروہ کی خوش گمانیوں کی کوئی حد نہیں تھی۔ اُس کو کم از کم اس وقت ایسا ہی لگ رہا تھا۔
نیہات ضمیر اسٹیج پر کمپیئرنگ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اُس کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ لوگ آجارہے تھے۔ اسٹوڈنٹس اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے۔ نیہات ضمیر اپنی دل موہ لینے والی آواز میں گانا سُنا

رہا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے سیل فون سے اُس کی ویڈیو بنا رہے تھے۔ ہر چہرہ جوش و خروش سے تمتما رہا تھا۔ جب گانا ختم ہوا تو بے تحاشا تالیاں بجا کر اُسے داد دی گئی۔

پھر بہت سارے آئیٹم ہوئے، ڈرامے ہوئے پھر نیہات نے امن اور عروہ کا نام اناؤنس کیا ڈانس کے لیے اور کس دل سے جلتے کڑھتے لیا یہ صرف وہی جانتا تھا یا اُس کا دل۔ گو کہ باہر کے لوگ چند ایک ہی تھے پھر بھی اتنے لوگوں کے سامنے امن کو عجیب جھجک مانع آرہی تھی۔ مرد اساتذہ نہیں تھے صرف فی میل ٹیچرز ہی تھیں۔ یہ سوچ کر امن نے خود کو تسلی بھری تھپکی دی۔

میوزک شروع ہوا تو انہوں نے بہت مہارت سے ڈانس کیا۔ کہیں بھی سر اور تال کو اپنے اسٹیپ سے اوپر نیچے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیا۔ ردھم کے ساتھ ایک ساتھ ایک جیسا ناچتی رہیں۔ ہال سے اُٹھ اُٹھ کر گرلز اور بوائز سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہونٹوں اور ہاتھوں کی مدد سے ہوائی بوسے اُچھال رہے تھے۔ بوائز اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر تھرک رہے تھے اور نیہات ضمیر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ امن کو کہیں غائب کر دے۔ ان لڑکوں کی نظروں سے کہیں دور چھپا دے یا پھر خود کہیں روپوش ہو جائے۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں، وہ کمپیئر تھا۔ اسٹیج پر رہنا اُس کی مجبوری تھی۔ اسی نہج پر سوچ کر وہ وہاں سے خود کو ہٹا نہیں سکتا تھا۔

☆......☆......☆

صبا اور فضا کا زیادہ وقت فاخرہ جبیں کے ساتھ گزرا تھا۔ صبا چھوٹی تھی تو فاخرہ اُسے اپنے ساتھ اسکول لے جاتی تھی۔ صحت مند بڑی بڑی آنکھوں والی صبا دوسروں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ خالہ اماں فاخرہ کو خود اسکول چھوڑ کر جاتی اور چھٹی سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اسکول کے آگے آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ چھٹی ہوتی تو فاخرہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورتی واپسی کی راہ لیتی۔

فاخرہ نے اسکول کے اندر ایک بچی صبا کو سنبھالنے کے لیے رکھی ہوئی تھی جو کہ چوکیدار نے ڈھونڈ کے دی تھی۔ فاخرہ کے اسکول کی ساری ٹیچرز صبا سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ تھی بھی تو بہت پیاری، میدے جیسی رنگت، نرم و ملائم صبا کے بعد فضا کی ذمہ داری بھی فاخرہ نے اٹھالی۔ دونوں بچیاں چونکہ سارا وقت ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس وجہ سے ماں سے لگاؤ اور گہری اُنسیت ایک تو فطری عمل تھا اور دوسری بات اور تھا بھی کون جو اُن کو اپنے قریب رکھتا، اُن کا خیال کرتا۔ ددھیال میں صرف دو چاچو تھے، جو زمان کی فاخرہ سے شادی کے بعد باری باری بہانے بنا کر گھر چھوڑ گئے تھے۔ اُن کو فاخرہ کا وجود گوارا نہیں تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ فاخرہ جیسی بے حیا عورت کے ساتھ رہ کر اُن کی بیویاں اور پھر اُن کی بیٹیاں بگڑ جائیں گی۔

وہ جو پہلے ہی اپنے اندھے ناکارہ بھائی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ اُن کو زمان کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ فارغ بیٹھے نکمے، ناکارہ مرد کو کما کر کھلانا اُن کو عذاب لگتا تھا۔ وہ بات بے بات اُسے جھڑک دیتے تھے۔ اُن کی نظر میں زمان جیسے ادھورے مرد کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جو گھر میں بے کار پرزے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ جو کسی کام کا نہیں تھا۔ ماں زمان کے کھانے پینے کا، پہننے اوڑھنے کا خیال رکھتی تھی۔ ایسے میں فاخرہ کا زمان کی زندگی میں آنا سب کی خلاصی کا بہانہ بن گیا۔ زمین جائیداد وہ پہلے ہی دھوکے سے اپنے نام لکھوا چکے تھے۔ فرقان کا جنرل اسٹور تھا جبکہ رحمان کی سونے کی دکان تھی۔ دونوں بھائیوں کا چلتا ہوا کاروبار تھا مگر دونوں کو ہی زمان کی تین وقت کی روٹی بھاری معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی بیویاں بھی ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر دونوں ماں بیٹے کو کھانا دیتی تھیں۔ لبنیٰ تو پھر بھی اچھی فطرت کی تھی مگر عائشہ تو کسی اور کا وجود برداشت

ہی نہیں کرتی تھی۔ اُسے اپنی ساس اور زمان کا وجود بھی کسی خار کی طرح چبھتا تھا۔

فاخرہ کا آنا اُن کی گلوخلاصی کروا گیا۔ دونوں چلے گئے کچھ ماہ کرائے پر رہے پھر ایک ساتھ دونوں بھائیوں نے گھر بنوائے اور شان سے رہنے لگے۔

فاخرہ ایم اے پاس سرکاری ٹیچر تھی۔ گوری چٹی اونچی لمبی، رسیلے ہونٹ، لمبے حسین چمکتے بال، وہ گلاب سے گلابی نازک بدن والی لڑکی اپنی ایک خطا کے عوض زمان کی جھولی میں پھینک دی گئی۔

وہ جو حسن میں یکتا تھی۔ خاندان کے سارے لڑکے اُس پر فدا تھے۔ سیکڑوں اُسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے خواہاں تھے۔ وہی باکمال لڑکی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہوکر بے اعتبار ہوگئی، نامعتبر ٹھہرائی گئی، معتوب ٹھہرا دی گئی اور اُس کے نتیجے میں فاخرہ جبیں کی شادی زمان سے ہوگئی۔ انمول ہیرا بے مول ہوگیا۔ بے قیمت ہوگئی وہ، اُس کا معیار گر گیا پھر کیا بھاؤ لگتے اُس کے۔ کوئی مول تول کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ اتنی ارزاں اور حقیر ہوگئی فاخرہ جبیں کہ رل گئی۔

سہاگ رات کو زمان کبھی رونے لگتا کبھی ہنسنے لگ جاتا۔ کبھی فاخرہ کی سنی سنائی تعریفیں کرتا، کبھی اُس کی سیاہ بختی پر رونے لگتا کہ اُس جیسی مکمل لڑکی نامکمل مرد کے پلے باندھ دی گئی۔

پورے خاندان میں فاخرہ جبیں کی قابلیت کے چرچے تھے۔ سب اُس کے حسن کے گن گاتے تھے جو زمان نے بھی سن رکھے تھے، واقف تھا مگر جہاں سب فاخرہ کے خواب دیکھتے تھے، فاخرہ کو پالینے کے تمنائی تھے۔ وہاں رحمان بھی اُس پر فریفتہ تھا مگر فاخرہ کسی کو بھی گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔

زمان نے تو کبھی اپنی بے نور آنکھوں میں اتنا مہنگا خواب سجانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ ادھورا تھا پھر اتنا مکمل سپنا کیسے پرونے کی جسارت کرسکتا تھا اور وہ بن مانگے تعبیر بن کر اُس کے من آنگن میں اُتر آئی تھی۔ پڑھی لکھی برسرروزگار فاخرہ جبیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خالہ اماں اور زمان اُسے دل سے قبول کرتے مگر انہوں نے بھی اُسے دھتکارنا اور ذہنی اذیت دینا شروع کردیا۔ جسمانی طور پر بھی خالہ اماں اُسے اذیت دینے سے باز نہیں آتی تھیں۔ زمان بھی اپنی لاٹھی سے اکثر اُسے پیٹ ڈالتا تھا۔ رات کے پُرکیف، سرور انگیز لمحوں میں کبھی کبھی زمان 'عاشق' بن جاتا تھا اور کبھی اک اَن دیکھی ہستی کا 'رقیب' بن کر فرخندہ کو بے عزت بھی کرتا تھا۔ اُس کے تیور بگڑ جاتے، چہرہ مزید بدصورت وکریہہ نظر آنے لگتا پھر وہ فاخرہ کے وجود کی دھجیاں اُڑانے لگتا۔ اُسے جسمانی اذیتیں دیتا۔ وحشت زدہ ہوکر اُسے بھنبھوڑ ڈالتا، بھڑک اٹھتا۔ طوفان اُٹھا دیتا۔ جو ہاتھ میں آتا فاخرہ کو مار دیتا، اپنا غصہ، اپنی ناکامی اپنا سارا زہر نکال کر فاخرہ کے بدن میں انڈیل دیتا۔ وہ ساری رات روتی رہتی، تڑپتی رہتی۔ سب کم ظرف تھے، سب اُس کا 'صبر' آزمانے پر تل گئے تھے۔

فاخرہ جبیں اس رشتے کو نبھاتے ہوئے پل صراط پر سے گزر رہی تھی۔ وہ پل پل سلگتی' تڑپتی، جیتی اور مرتی تھی۔ اُس کے اندر تپش، گھٹن، حبس، آگ بڑھتی جارہی تھی۔

زمان ساری تنخواہ اُس کے ہاتھ سے لے لیتا تھا اور فاخرہ اپنی ضرورتوں کے لیے پیسے زمان سے مانگا کرتی۔ وہ سب فاخرہ کو بلیک میل کررہے تھے، خوار کررہے تھے۔ اُس کی عزتِ نفس تار تار ہوچکی تھی۔ کہیں امان نہیں تھی، کہیں آسودگی نہیں تھی۔ وہ خود کما کر بھی خالی ہاتھ رہ جاتی تھی۔ کیسی بے سروسامانی تھی، کیسے بے آسرا ہوئی تھی وہ۔ میکے والے منہ موڑ چکے تھے اور اب تو شہر ہی چھوڑ گئے تھے مگر فاخرہ کو تپتے الاؤ میں پھینک گئے تھے، جہاں وہ رات دن جلتی تھی، کٹتی

مرتی تھی مگر زندہ تھی۔
پھر صبا آ گئی۔ فاخرہ کے بے قرار دل کو قرار آ گیا۔ وہ بہل گئی، سنبھل گئی، جینے لگی۔ صبا تھی بھی تو من موہنی سی، بالکل فاخرہ کی طرح۔ تب فاخرہ نے اپنے اندر توانائی جمع کی اپنی بیٹی کے لیے۔ اب وہ ایک ماں تھی اُسے اپنی بیٹی کے لیے جینا تھا۔ شاید اُس کے بچے اُس کا یقین بن جائیں، سہارا بن جائیں۔
صبا کے لیے اسکول کے اندر چوکیدار نے کسی بے آسرا بچی کا انتظام کر دیا تھا، صبا کو سنبھالنے کے لیے اور وہ بچی یتیم تھی۔ فاخرہ کو وہ بہت اچھی لگنے لگی تھی مگر وہ اُسے خالہ اماں کی وجہ سے اپنے گھر لے کر نہیں آ سکتی تھی، ورنہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُس بچی کو پڑھائے لکھائے، آسرا دے، پناہ دے مگر وہ تو خود بے اماں تھی، کمزور تھی، اُس کی قسمت کے فیصلے تو خود دوسروں کے ہاتھ میں تھے۔ پھر وہ کسی اور کی قسمت بدلنے کا ارادہ کیسے باندھ سکتی تھی۔ جب یقین ہی نہیں تھا کہ وہ اِن ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا بھی سکے گی۔
"لوگوں نے اپنی اپنی زندگیوں میں کیا کیا گل نہیں کھلائے اور میں نے ایسا کیا کر دیا جس کی سزا ساری زندگی بھگتنی پڑے گی۔ زمان اور خالہ میرا جینا حرام کیے رکھتے ہیں۔ آخر کب میری سچائی پر لوگ یقین کریں گے۔ کب تک مجھے بہتان تراشیوں اور تہمتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" فاخرہ ہر روز اپنا محاسبہ کرتی روز زندگی کے لمحے شمار کرتی۔ آسودگی کم اور اذیتیں زیادہ جمع ہو جاتیں، وہ روز جوڑ توڑ کرتی مگر حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔
"تمام عمر لوگ گناہوں کی دلدل میں دھنسے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے عیوب کو اپنی رحمتوں کی چادر سے ڈھانپے رہتا ہے۔ وہ لوگ زمانے میں قابلِ عزت بن کر شاہانہ زندگی گزار دیتے ہیں۔" وہ تمام دن کڑھتی رہتی سلگتی رہتی۔
زندگی میں جب برا ہوتا ہے تو پھر ہوتا چلا جاتا ہے، پے در پے صدمات انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ مگر فاخرہ اپنی اولاد کے کسی بھی معاملے میں کوئی کوتاہی و لاپروائی نہیں برتنا چاہتی تھی۔ زمان اور خالہ اماں سے مایوس ہو کر اُس نے اپنی تمام توجہ اور محبت صبا پر لگا دی، پھر فضا آ گئی۔ فاخرہ اُن پھول سی بچیوں کو دیکھ دیکھ کر جینے لگی۔ اب زمان اُسے جتنی بھی لفظوں کی مار مارتا، کتنا ہی پیٹ ڈالتا وہ اپنی بیٹیوں کے لیے اپنی ساری اذیت بھول جاتی۔ فضا اور صبا میں بالترتیب ایک سال کا وقفہ تھا۔
جب بھی لبنیٰ یا عائشہ کے میکے سے عیدی آتی تھی تو خالہ اماں اسپیشلی صبا اور فضا کو ساتھ لے کر اُن کے گھر جاتی تھیں اور وہاں سے آنے کے بعد صبا اور فضا سو سو سوال کرتیں۔
"مما نانا ابو کہاں ہیں۔ ہمارے ماموں، ہماری نانو کہاں ہیں۔ ہماری عیدی کیوں نہیں آتی؟" اُن کے تجسس میں ڈوبے سوال فاخرہ کے اندر بے چینی، اضطراب اور کڑواہٹ بھر دیتے۔
"عائشہ چاچی کی امی نے اتنے سارے سوٹ بھجوائے ہیں۔ فروا آپی اور عروہ آپی کے لیے بھی سوٹ، جوتے، کچر، پونیاں بھی بھجوائی ہیں۔"
"بتائیں نا مما آپ کو نانو عیدی کیوں نہیں بھجواتیں۔ ہماری نانو کہاں ہیں؟" صبا پوچھتی تو فاخرہ کا دل جیسے کوئی کند چھری سے کاٹتا رہتا۔ اُسے اپنی سانسیں بوجھ لگنے لگتیں۔ وہ بے بسی سے اپنی بیٹی کو دیکھتی رہتی۔ بے بسی کا دبیز احساس فاخرہ کو کچوکے لگاتا رہتا۔ اپنوں کی بے اعتباری، بے اعتنائی اور لاپروائی نے اُسے یہ دن دکھائے تھے۔ وہ قسمت پر شاکر رہنے والی اب شاکی رہنے لگی۔ اللہ سے شکوہ کرنے لگی، گلہ کرنے لگی۔ زندگی نے اُسے کس دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا۔ ہر دن نئی تکلیف ہر دن نیا سوال۔

وہ صبا کو کیا جواب دے کر مطمئن کرتی، جھوٹ کا پلندہ یا سچ، جھوٹ بولنے سے وقتی طور پر تو وہ مان جاتی یقین کر لیتی مگر زندگی میں کبھی فاخرہ کا جھوٹ کھلنے پر اُس کا ردعمل کیا ہوتا۔ یہی بے یقینی صبا کی آنکھوں میں ٹھہر جاتی۔ فاخرہ جھرجھری سی لیتی نہیں وہ سب کی بے یقینی و بے اعتباری سہہ گئی مگر وہ اپنی اولاد کی نظروں میں بے اعتبار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ہر ماں اپنی اولاد کی بے یقینی سے ڈرتی ہے۔ سوال کرنے سے ڈرتی ہے۔ ایسے سوال جن کا جواب اُن کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر فاخرہ سچ بتا دیتی تو پھر صبا کے معصوم ننھے سے ذہن میں ہزاروں سوال اور اُگ آتے اور فاخرہ ٹال مٹول سے کام لیے جاتی، بس آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی۔

لبنیٰ فاخرہ کی کزن تھی اور دوست بھی رہی تھی اس لیے کبھی کبھار چوری چھپے فاخرہ کو فون کر لیتی، تب فاخرہ بھی اپنے دکھ سکھ اُس سے بانٹ لیتی تھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔

صبا اور فضا کی اسکولنگ کی وجہ سے اُن کے دل میں اُبھرتے کئی نوکیلے سوال وقتی طور پر دب گئے تھے۔ فاخرہ نے اپنی طرف سے کوشش کی کہ دوبارہ صبا فضا کو اپنے چاچو لوگوں کے گھر نہ جانے دے۔ عائشہ اور رحمان اس طرح تو اُس کی بچیوں کا ذہن اور زہر آلود کر دیں گے۔ ان میں شکوک وشبہات اور بدگمانیاں بھر دیں گے اور ایک دن اُس کی اپنی اولاد ہی اُس کی مخالف بن کر اُس کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔

فضا اور صبا کا ذہن بٹ جائے، اُن کے خیالات بکھر جائیں۔ ایسا فاخرہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اب وہ خالہ اماں کے سامنے اکڑنے لگی تھی۔ ضد کرنے لگی تھی اپنی بچیوں کے لیے۔ جب جب وہ صبا اور فضا کو رحمان یا فرقان کے گھر لے کر جانا چاہتی تھی۔ تب فاخرہ تن جاتی۔ اُن کو جانے نہیں دیتی تھی۔ بدلے میں خالہ اُسے مار مار کر اَدھ موا کر دیتیں مگر فاخرہ

اس معاملے میں خالہ کو اپنی من مانی نہیں کرنے دیتی تھی۔ لبنیٰ اور عائشہ نے کبھی اپنی ساس کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا اور وہ خبیث عورت سارے بدلے فاخرہ سے ہی لے رہی تھی۔ چار چوٹ کی مار دیتی تھی بات بے بات اُسے طلاق کی دھمکی دی جاتی تھی۔

پھر خالہ اماں نے فاخرہ کی 'رکھوالی' کے لیے ایک عورت رکھ لی۔ بشیراں اب کسی سائے کی مانند اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ فاخرہ کی تنخواہ سے ہی بشیراں کو تنخواہ دی جاتی تھی۔

اسی دوران اسوہ اور پھر اسد دنیا میں آ گئے تھے۔ بشیراں نے جب فاخرہ کے حالاتِ زندگی دیکھی تو اُس کی تمام تر ہمدردیاں فاخرہ کے ساتھ ہو گئیں۔ وہ اُس کی خیرخواہ تھی۔ اُسے بہت ترس آتا فاخرہ پر اور ایسی بے جوڑ شادی پر وہ کفِ افسوس ملتی رہتی۔

صبا آٹھویں کے پیپر ز دینے والی تھی، فضا ساتویں میں جبکہ اسوہ ابھی چوتھی کلاس میں تھی۔ تینوں بہنیں ہی اپنی ماں کے ساتھ بہت اٹیچ تھیں۔ احساس کرنے والی حساس بچیاں تھیں۔ تابعدار بھی تھیں۔ مگر اسد کبھی کبھی اکھڑ پن اور بدتمیزی کا مظاہرہ کر جاتا تھا۔ دادی اُس کا ذہن خراب کر رہی تھیں۔

اتوار کا دن تھا۔ فاخرہ نے فجر کی نماز کے بعد واشنگ مشین لگائی تھی پھر ناشتا بنانے لگی۔ زمان کے لیے دودھ والا دلیہ بنانا تھا۔ آج کل زمان کا پیٹ خراب رہنے لگا تھا۔ فاخرہ نے پراٹھے بنائے، رات کا سالن گرم کیا پھر چائے بنانے لگی۔ تبھی باہر واشنگ مشین کی سیٹی بجی تھی۔ فاخرہ نے برنر کی آنچ ہلکی کی اور چھوٹے سے صحن میں نکل آئی۔ واشنگ مشین سے کپڑے نکال رہی تھی۔ تبھی اُس کی چٹیا کا زور کا جھٹکا لگا۔ فاخرہ بروقت سنبھلی اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر اُس کو موقع نہیں دیا گیا۔ اس بار کا جھٹکا شدید تھا اتنا شدید کہ وہ اگلے ہی پل زمین پر گر پڑی۔ ایک اسی

سالہ بوڑھی عورت کی نفرت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ جب جی چاہے چھتیس سالا فاخرہ کو روئی کی مانند دھنک دیتی تھی، پٹخ دیتی تھی، گرادیتی تھی۔ فاخرہ نیچے گری زمین کا حصہ بن رہی تھی۔ دھول مٹی جیسی، بے توقیر کم مایہ۔

''ساری چائے اُبل گئی۔ چولہا خراب ہوگیا۔ اندھی ہے کیا۔'' اُس نے فاخرہ کے پیٹ پر لات ماری، اس سے پہلے کہ فاخرہ اپنا بچاؤ کرتی فضا، صبا اور اسوہ نے آ کر اپنی دادو کو پکڑ لیا تھا۔ خالہ اماں کی درد ناک چیخیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ تینوں بچیوں نے اپنی دادو کو زمین پر گرایا ہوا تھا اور دانتوں اور ناخنوں سے اُسے کاٹ رہی تھیں۔ چٹکیاں کاٹ رہی تھیں۔ خالہ اماں واویلا مچا رہی تھی۔ فاخرہ زمین سے اُٹھی تو کچھ لمحے تو وہ شاک کی کیفیت میں یہ منظر دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر خالہ کو اُن کے چنگل سے آزاد کروایا۔

''ہائے میرے ربا، مجھے کھا گئیں چڑیلیں، میرا خون نکال دیا، جیسی ماں حرافہ ویسی ہی چنڈالیں ہیں۔ یہ حرام زادیاں۔'' خالہ اماں اپنے بازوؤں کو دیکھ کر رودی، دانت کھبے ہوئے تھے اُن کی سوکھی کلائیوں میں۔ خون بھی رس رہا تھا۔ وہ صحن میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی، کوسنے بددعائیں دینے لگی۔

''اب پتا چلا کتنی تکلیف ہوتی ہے۔'' تینوں بہنوں نے زبانیں نکال کر دادو کو چڑایا اور اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔ فاخرہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ خوش ہوتی یا مغموم اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

مگر آج پہلی بار اُس نے اپنے اندر ڈھیروں اطمینان اُترتا دیکھا وہ اکیلی نہیں تھی کوئی اُس کا تھا اُس کو بچانے والا، اُس کا اپنا۔ فاخرہ تو عادی ہوچکی تھی۔ مار کھانے کی یا شاید ڈھیٹ بھی، یا پھر اذیت پسند۔

خالہ اماں فاخرہ کو اور اس کی بیٹیوں کو گالیاں دیتی رہیں۔ برا بھلا کہتی رہی مگر وہ اتنی بے دم ہوچکی تھی۔ اس وقت کہ دوبارہ اُس نے فاخرہ پر جھپٹنے کی کوشش نہیں کی اور بکتی جھکتی اُٹھ کر اندر زمان کے پاس چلی گئی۔ فاخرہ نے کپڑے دھو کر تار پر پھیلائے اور کپڑے مشین میں ڈال کر پھر کچن میں آگئی اور دلیہ بنانے لگی پھر دلیے کی بھاپ نکال کر اُسے ٹھنڈا کر کے پلیٹ میں ڈال کر فاخرہ زمان کو دینے گئی تو خالہ اماں اُس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

''زمان دلیہ کھلاؤں۔'' فاخرہ نے پاس بیٹھ کر کہا۔

''نہیں مجھے نہیں کھانا۔'' وہ ساٹھ سال کا تھا آج کل اکثر بیمار رہنے لگا تھا۔

''کیوں نہیں کھانا۔''

''بچیوں نے اماں سے اتنی بدتمیزی کی، اُن کو کاٹ ڈالا اور تم چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں۔'' اُس نے ہاتھ اِدھر اُدھر مار کر اپنی لاٹھی ٹٹولی اور اندازے سے فاخرہ کو ماری اُس کی کمر میں لگی۔ ایک زوردار آہ بلند ہوئی اور کمرے کی فضا میں گم ہوگئی۔

''دفع ہوجا یہاں سے بدکردار عورت، گندگی کی پوٹ، نظروں سے دور ہوجا۔'' وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

''زمان تمہیں میں کون سا نظر آتی ہوں جو تمہاری نظر سے دور ہوجاؤں۔''

''مجھے اندھا ہونے کا طعنہ دیتی ہے ناگھٹیا عورت، جا دفع ہوجا۔ تُو اس قابل بھی نہیں تھی کہ تجھے کوئی اندھا لولا لنگڑا بھی قبول کرلیتا۔''

''کون جانے زمان، کون کس کے قابل تھا۔ یہ تو وقت کے ہیر پھیر ہیں۔ تقدیر کے فیصلے تھے یا اپنوں کی ستم ظریفی کہ آج میں ان حالوں میں ہوں۔'' وہ دکھ سے ہنسی ایسی ہنسی جیسے بہت سے کانچ ایک ساتھ ٹوٹے ہوں۔

''اب تیری زبان بھی چلنے لگی ہے بدتمیز عورت۔ بھول رہی ہو کہ شوہر کا اسلام میں کیا مقام ہے۔''

(اس خوب صورت ناولٹ کی
اگلی قسط ماہِ مئی میں ملاحظہ فرمائیں)